Price Rs. 2.50

چائے کے باغ

قرۃ العین حیدر

حلقۂ ادب، بمبئی ۲۶

حلقۂ ادب
۱۰، سیلتا محل - بومن جی پیٹٹ روڈ
بمبئی نمبر ۲۶

پہلی بار

مارچ ۱۹۶۵ء

تعداد اشاعت گیارہ سو ۱۱۰۰

قیمت ۴ روپے
~~پچیس ۲۵~~
~~دو روپیہ پچیس پیسہ~~

(ہلال پریس بمبئی نمبر ۹)

جمیلہ ہاشمی کے نام

آواز	تصویر
بنگالی لوک دُھن	فیڈ اِن ———
" " "	۱- کلوزاپ دو پتّیاں اور ایک کلی سُوپرامپوزڈ ٹائیٹل
" " "	۲- چائے کی جھاڑی
" " "	۳- چائے کا باغ - مزدور لڑکیاں
" " "	۴- لونگ شوٹ جنگل - ندی (ماحول تعمیر کرو)
چوڑیوں کی جھنکار - پانی کی آواز - بھٹیالی گیت	۵- فینچو گنج کا پل - دریا کشتیاں
	۶- اسٹیمر گھاٹ
"چائے کے باغات کی،	۷- برم چال - ریلوے اسٹیشن
حسین رومان پرور فضائیں	۸- مزدور مسکراتے چہرے
جہاں دھرتی کے جیالے بیٹے،	۹- چائے کی فیکٹری
دھرتی کے مدھر حیات بخش	۱۰- مزدور کام کر رہے ہیں۔
گیت گاتے ہوئے چائے کی پتیاں تیار کرتے ہیں اور	۱۱- مزدوروں کا لوک ناچ شگفتہ چہرے

سیکوئینس ۲

گھنا جنگل۔ (ماحول تعمیر کرو)	"چاروں طرف اندھیرا
ایک جیپ گذر رہی ہے۔	جنگلوں میں خوبصورت باگھ
کلوزاپ۔ بندوقیں سنبھالے	بگھیلے اور ہرن اور دُور دُور
ہوئے غیر ملکی سیّاحوں کے	سے آنے ہوئے سیلانی
مسکراتے چہرے۔	اور شکاری ______

ٹرین ایک جھٹکے کے ساتھ شمشیر نگر کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رُک گئی۔ میں نے لکھنا ملتوی کر کے اسکرپٹ کے پہلے ڈرافٹ کے کاغذات بیگ میں ٹھونسے اور پلیٹ فارم پر اُتری۔ شام ہو رہی تھی۔ اور اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا۔ اسٹیشن سنسان پڑا تھا۔ سب ڈویژنل افسر کو ڈھاکے سے تار دینے کے باوجود وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ کیونکہ بنگال کے باسی وقت کے متعلق ایک نہایت فلسفیانہ نظریہ رکھتے ہیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ایک دیوہیکل امریکن اور چُست پتلون میں ملبوس سنہرے بالوں والی ... کی میم ٹرین سے اُتر کر پلیٹ فارم کے پھاٹک

کی طرف جا رہے تھے جس سے ذرا فاصلے پر چند جیپ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ قلی نے میرا سامان اٹھایا اور میں نے سوچا کہ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر سے ایس۔ ڈی۔ او کو فون کرنے کی کوشش کروں حالانکہ مجھے مقامی ٹیلی فون سسٹم کا بھی خاصا تجربہ تھا۔

"اسلام علیکم" ایک گرجدار آواز آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سیاہ شیروانی اور شرعی پاجامے میں ملبوس ایک باریش بزرگ خوش خلقی سے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

شاید یہی سب ڈویژنل افیسر تھے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"آپ — ؟" انھوں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"جی —"

"بڑی خوشی ہوئی، بڑی خوشی ہوئی؛ مجھے اردو ادب سے اب دلچسپی نہیں رہی کہ وہ روز بروز مزید غیر اسلامی ہوتا جا رہا ہے۔ مگر میری اہلیہ آپ کے افسانے بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔"

"جی۔" میں نے جھینپ کر انکسار کے ساتھ ہنسنے کی کوشش کی۔

"خاکسار کو بیگ کہتے ہیں۔

"میں یہاں ٹی ریسرچ پر لگا ہوا ہوں۔ آئیے آئیے۔ میرے ہمراہ تشریف لے چلئے۔ میں ایک عزیز کو لینے آیا تھا۔"

میں نے ان کو بتایا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں اور کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ ان کے عزیز (وہ بھی پارسیں تھے) سامان اٹھوا کر نزدیک آئے۔ جیپ میں اسباب رکھا گیا اور اونچے نیچے راستے پر ہچکولے کھاتے ہم لوگ سر تی منگل کی سمت روانہ ہوئے۔ امریکن کی جیپ دھول اڑاتی آگے آگے جا رہی تھی۔ دھول سے بچنے کے لئے۔ میں سولائنڈر کے پردے سے سٹ کر بیٹھ گئی۔ ادھر ادھر کی چند باتیں کرنے کے بعد گاڑی چلاتے چلاتے انھوں نے دفعتاً مڑ کر مجھے مخاطب کیا "عزیزہ۔ اسلامی ناول لکھئے۔ ملت کی کشتی۔" گیئر بدلتے ہوئے انھوں نے کہا۔

"ڈانواں ڈول ہے۔"

"جی ___"

"معاف کیجئے گا۔ ڈاک بنگلہ جنگل کے عین وسط میں ہے اور آج بالکل خالی پڑا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے رسان سے جواب دیا۔ "میں مشرقی

پاکستان کے دُور اُفتادہ ڈاک بنگلوں میں رہنے کی عادی ہوں۔" بارِشیں بزرگ (وہ بزرگ قطعی نہیں تھے۔ سینتالیس اڑتالیس سال کے رہے ہوں گے۔ مگر ایک نہایت رعب دار سیاہ داڑھی اور بھاری بھرکم جُثّے نے شانِ بزرگی عطا کر رکھی تھی) میرے متعلق بہت خلوص کے ساتھ فکرمند نظر آرہے تھے۔ میرے اس طرح تن تنہا اور بے پردہ جنگل جنگل گھومنے سے ان کو کتنا دکھ ہوا ہوگا۔ میں نے سوچا اور فوراً سر ڈھانپ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کلمہ جانتی ہیں" انھوں نے اچانک سوال کیا۔

"جی۔"

"پانچوں کلمے۔"

"جی۔"

"تعلیماتِ قرآنی پر عمل پیرا ہیں؟" پھر اسی اچانک پن سے وہ اپنے رشتے دار کی طرف مڑے "میں کہتا ہوں۔ نوجوانو — اسلام کی خاطر انجن بن جاؤ — انجن بن جاؤ۔" لفظ "انجن" انھوں نے تقریباً گرج کر ادا کیا۔ رشتے دار نے سر ہلایا۔

جیپ ڈاک بنگلے کے احاطہ میں داخل ہوئی۔" رات کا کھانا غریب خانے پر تناول فرمائیے۔ میں اور میری اہلیہ گھنٹے بھر میں آن کر آپ کو لے جائیں گے۔" بارش بزرگ نے مجھ سے کہا۔

چوکیدار لپکا ہوا آیا۔

"کہو نور العباد۔ کیسے ہو؟" میں نے خوش ہو کر اس سے پوچھا چھدری داڑھی اور نیلی تہمد والے نور العباد کی باچھیں کھل گئیں۔ بارش بزرگ نے خدا حافظ کہا اور جیپ زنّاٹے سے باہر نکل گئی۔

نور العباد نے ایک کمرہ کھول کر لالٹین میز پہ رکھ دی۔

" تم کو یاد ہے نور العباد۔ ہم چار سال ہوئے یہاں آئے تھے۔"

"خوب یاد ہے۔ مس صاحب۔ آپ لوگ ادھر مانی پوری ناچ کی فلم بنانے آیا تھا شوٹنگ کرتا تھا۔"

" تمہارے بیوی بچے راضی خوشی ہیں نور العباد۔"

" اب چار چھوکڑا اور ہو گیا ہے۔ مس صاحب"

" اب کتنے بچے ہیں تمہارے۔"

" اب سب ملا کر نو چھوکڑا ہے مس صاحب۔" اس نے خوشی سے جواب دیا " میں چائے لاتا ہوں۔"

مانوس کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

لوہے کا پلنگ بھدّی، مدھم آئینے والی سنگھار میز، خالی مچھر دانی غسلخانے کی بالٹی اور ٹب میں تازہ پانی بھرا تھا اور تام چینی کا جگ اور چلمچی کھردری سفید میز پر سلیقے سے دھری تھی کھڑکیوں سے نیچے اونچی اونچی گھاس لہرا رہی تھی۔ دُور باورچیخانے میں لالٹین ٹمٹماتی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر میں شاگرد پیشے کی طرف گئی۔ نور العباد کی سانولی سلونی بیوی، بغیر بلاؤز کے اودی ساری لپیٹے دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اس کی بوڑھی ساس فرش پر بیٹھی نواں پوتا کھلا رہی تھی۔ میں اُن دونوں سے ٹوٹی پھوٹی بنگالی میں باتیں کرتی رہی۔ نور العباد نے باورچیخانے کے دروازے میں سے جھانک کر آواز دی "مِس صاحب چائے تیار ہے"۔ میں نے کمرے میں آکر چائے پی اور لالٹین کی روشنی میں بالوں میں سے دھول جھاڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر بارش بجا۔ بادیشں بزرگ اور ان کی اہلیہ ؟ چپکے تھے۔

ٹی ریسرچ اسٹیشن کے سپنٹنڈنٹ کے نئی وضع کے چھوٹے چھوٹے بنگلوں میں سے ایک کے سامنے بارِیش بزرگ نے کار روک دی۔ اسوقت وہ اپنی سیاہ رنگ کی سٹوڈ بیکر یا

آئے تھے، برآمدے میں داخل ہو کر لیٹر بکس پر لکھے ہوئے ان کے پورے نام پر نظر پڑی۔ ایم۔ ایس۔ اے بیگ، اس کے ساتھ سائنس کی متعدد ڈگریاں درج تھیں۔ ان کی اہلیہ مشرقی یو۔ پی کی ایک شرمیلی، کم عمر گھریلو لڑکی تھی جس نے کاسنی چھینٹ کے غرارے اور ڈورئیے کی چمپئی قمیض پر ململ کا چنا ہوا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس کا نام کلثوم تھا۔ ڈرائنگ روم میں بہت سے مہمان جمع تھے جنھوں نے باریش بزرگ کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"آہاہا۔ مرزا صاحب آگئے"۔ مہمانوں میں دو ترک بھی شامل تھے جو چائے کی کاشت کی ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے انقرہ سے آئے تھے۔ کھانے سے پہلے میں نے اپنی کزن نازنین کو ہری نگر ٹی اسٹیٹ فون کرنا چاہا تھا مگر فون خراب ہو چکا تھا۔

"چلئے ہم لوگ کلب چلتے ہیں۔ وہاں آج فلم شو ہے۔ اسلئے یقیناً آپ کی ہمشیرہ بھی آئیں گی"۔ باریش بزرگ نے کہا۔

"کلب کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ دور نہیں۔ کوئی پچیس میل ہوگا"۔

"پچیس میل"؟ نو وارد رشتے دار نے دہرایا۔

"یہاں چائے باغان کے فاصلے اسی نوع کے ہیں۔ برادر بلہٹ میں

ایک سو بیس باغات ہیں اور جب ہم لوگ دوستوں سے ملنے کی غرض سے نکلتے ہیں تو سو پچاس میل کا پالا مار کر آتے ہیں۔
آپ کے برادرِ نسبتی کی ٹی اسٹیٹ ؟" بارلیش بزرگ نے اب مجھے مخاطب کیا " یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر ہے"۔
کھانے کے بعد موٹریں اور جیپ گاڑیاں کلب روانہ ہوئیں۔ بارلیش بزرگ کی اہلیہ نے بچے کو سُلا کر جلدی سے سیاہ برقعہ اوڑھا اور کار کی پچھلی سیٹ پر میرے پاس آن بیٹھی "میں پکچر دیکھنے کے لئے کبھی کبھار ہی کلب جاتی ہوں ۔ اِن کو یہاں کی سوشل زندگی پسند نہیں"۔
" خدا کرے زرینہ کلب میں مل جائے ۔ ورنہ بڑی کوفت ہوگی"۔ میں نے کہا " میں تو ارسلان بھائی کو پہچانتی بھی نہیں"۔
" آپ اپنے برادرِ نسبتی سے آج تک نہیں ملیں ؟" بارلیش بزرگ نے پوچھا۔
" جی نہیں"۔
" آپ کے برادرِ نسبتی کلکتے کے بنگالی ہونے کے ناطے معقول اُردو بولتے ہیں۔ اور بہت صالح مسلمان ہیں" بارلیش بزرگ نے مجھے مطلع کیا اور کار چلانے میں مصروف رہے ۔

کلب کے احاطہ میں ان گنت موٹریں کھڑی تھیں۔ ہفتہ وار فلم شو کی وجہ سے دُور دُور کے باغات سے لوگ آئے تھے۔ قدیم برطانوی عہد میں بنی ہوئی عمارت کے اندر چیاد بگان کی "اعلیٰ سوسائٹی" جگمگا رہی تھی۔ اسکاٹش ٹی پلانٹرز، قریبی ضلاع کے نئے کارخانوں کے چند امریکن اور جرمن، فینچو گنج کے نئے کھاد کے کارخانے کے جاپانی انجینیر اور ان کی خواتین، چیاد کے باغات کے نوجوان پاکستانی عہدیدار اور ان کی الٹرا ماڈرن بیگمات۔ باغات میں عموماً ملک کے اونچے طبقے کے نوجوان کام کرتے تھے کیونکہ یہ ایک بیحد فیشن ایبل اور انتہائی "ہائی کلاس" ملازمت تھی۔ یہ سب زیادہ تر مغربی پاکستان سے آئے تھے۔

میں کلثوم کے ساتھ چمڑے کے ایک دبیز صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہال کی روشنیاں بجھیں اور ایک معمولی سا امریکن فلم شروع ہوا جو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ سینکڑوں کا مجمع فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔ باہر گھُپ اندھیرے میں سینکڑوں میل تک چیاد بگان، جنگل اور گاؤں پھیلے ہوئے تھے۔ پیچدار راستے، ندیاں اور ابدی سناٹا۔ نارنگی کی ڈالیوں کی موسیقی ریز سرسراہٹ۔ تاریکی

حد وسعت اور تنہائی کے اس کھنور میں برطانوی انداز کے
اس کلب کے اندر یہ تین چار سو افراد، مخملیں مد بیز جہازی
صوفوں میں دھنسے ڈور ٹس ڈے کا تماشہ دیکھنے میں منہمک
تھے۔ ان کا اس دھرتی سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ سوائے رو پئے کے
کوئی ہمدردی نہ تھی۔ کوئی تعلق نہ تھا۔ اور انہی افراد کی طرح
کے لوگ صرف چند میل دُور، سرحد کے اُس پار، اسی معطر،
دھرتی، اسی زرخیز مٹی پر، انہی نشیلے اندھیرے میں آسام کے
چاء بگان میں اسیطرح برطانوی وضع کے کلبوں میں بیٹھے اسی قسم
کی فلم دیکھنے میں مصروف ہوں گے۔ یہی لب و لہجہ۔ یہی ذہنیتیں۔
یہی تراش خراش اور وضع قطع۔ یہی اندازِ گفتگو۔ یہی دلچسپیاں
وہاں بھی ایسی عہدیداروں کی بیویاں اسی قسم کی ساڑیاں پہنے
اسی تازہ ترین وضع کے بال سنوائے ایسی ہی سطحی گفتگو میں مشغول
ہوں گی۔ ان سب لوگوں کا، اس قدیم، دُکھی۔ زخمی۔ دھرتی سے
کیا سمبندھ تھا۔؟ زمین کا رشتہ انسان سے کس طرح بندھتا ہے؟
کس طرح ٹوٹتا ہے؟ کس طرح استوار کیا جاتا ہے؟

روشنیاں جلیں۔ کلثوم نے فوراً منہ پر سیاہ جارجٹ کی نقاب
گرالی۔ میں نے کھڑے ہو کر زرینہ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

اور کلثوم بانو کے ساتھ ہال کے سرے پر آ گئی۔

اتنے میں پیچھے سے کسی نے میرا نام لے کر خوشی کا نعرہ بلند کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

میری پھوپھی زاد بہن زرینہ سبز ساری پہنے، کندن کے زیوروں میں جگمگ جگ کرتی، دلہن بنی کھڑی تھی۔ ہم دونوں دوڑ کر ایکدوسرے سے لپٹ گئے اور خوشی کے مارے دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئیں۔

اس اثنا میں کلثوم مجمع میں کھو چکی تھی۔ میں اور زرینہ باتیں کرنے کے لئے جلدی سے پاؤڈر روم میں گھس گئے۔ جہاں چند غیر ملکی خواتین اپنی اپنی ناکوں پر پاؤڈر لگا رہی تھیں۔ ہم دونوں کو بے طرح شور مچاتے دیکھ کر ایک اسکاٹش بڑھیا نے مسکرا کر آنکھیں چندھیائیں۔

"مسز ینگ ڈانلڈ —" زرینہ نے جلدی جلدی کہا۔ "یہ میری کزن ہے۔ ہم تقسیم کے بعد آج ملے ہیں —" پھر اس نے پاؤڈر روم میں داخل ہونے والی مزید شناسا خواتین سے میرا تعارف کرانا شروع کیا۔

"زرینہ ہمیں ذرا باہر جا کر اپنے میزبانوں کا شکریہ تو —"

"مسز عثمانی — یہ میری کزن — کیونکہ میں تو صرف تین سال ہوئے لکھنؤ سے شادی کر کے — شادی ہو کے — یہاں آئی ہوں — اسلئے ابتک "۔ اس نے ہڑبڑا کر پھر داستان شروع کی۔

"زرینہ میرے میزبان —"

میں جلدی سے باہر نکلی اور ہال میں کلثوم سے ٹکرا گئی۔

"آپ کے دولھا بھائی ارسلان احمد صاحب آپ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں" اس نے کہا۔ اتنے میں پارسیں بزرگ بھی ہجوم میں سے نمودار ہوئے۔ میں نے ان دونوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور وہ میاں بیوی ہال کے بڑے دروازے سے نکل کار پارک کی طرف چلے گئے۔

اب بیگمات اور خواتین کے انبوہ کلب کے کینٹین سٹور کا رُخ کر رہے تھے۔ "چلو مجھے بھی تھوڑا سا سامان خریدنا ہے" زرینہ نے میرے قریب آکر کہا۔ اور اپنے شوہر سے ملوایا۔ "یہ تمہارے ارسلان بھائی ہیں۔ دیکھ لو۔"

اسٹور کے ایک کاؤنٹر کے پاس وہ سنہرے بالوں والی میم کھڑی تھی جسے میں نے شام ریلوے اسٹیشن پہ دیکھا تھا۔

بہت سے حضرات اس کے گرد جمع تھے جن سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ اس کی گلیمرس شخصیت نے وہاں کافی تہلکہ مچا دیا تھا۔

"یہ عورت امریکن ہرگز نہیں ہے۔ ہندوستانی۔ میرا مطلب ہے، پاکستانی ہے۔ شرط لگا لو۔" دور سے اُسے دیکھ کر زرینہ نے میرے کان میں کہا۔

"تم جانتی ہو اسے؟"

"نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ شاید تم بھی واقف ہو۔" اس کے قریب سے گذرتے ہوئے اسے ایک نظر غور سے دیکھنے کے بعد میری کزن نے جواب دیا۔

ارسلان بھائی نے قریب آ کر کہا۔ "زرینہ مسٹر اور مسز فریزر بھی ہمارے ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کی جیپ خراب ہو گئی ہے۔ یہ لوگ کرنل مورگن کے یہاں ٹھہرے ہیں۔" ارسلان بھائی اسٹور سے باہر چلے گئے۔ زرینہ امریکن خاتون کے پاس مارچ کرتی ہوئی پہنچی۔ اور بڑی معصومیت سے پلکیں جھپکا کر اردو میں پوچھا۔ "معاف کیجئے گا۔ آپ راحت کاشانی ہیں نا؟" میم نے چونک کر اُسے دیکھا، چند لحظوں تک دیکھتی رہی اور

یہ ظاہر کیا کہ وہ اُردو نہیں جانتی۔

"اوہ۔ کم آن راحت" زرینہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

"میرا نام۔" میم نے بڑے وقار سے ایسی انگریزی میں جس میں امریکن لہجے کا برائے نام شائبہ تھا۔ جواب دیا "مسز چارلس فریزر ہے۔ ریٹا فریزر۔"

دوسرے لمحے چارلس فریزر نے اسے آواز دی اور وہ باہر چلی گئی۔

"اور تو اور۔ یہ نام بھی بوگس ہے۔ شرط لگالو" زرینہ نے کہا۔

ارسلان بھائی کار کا دروازہ کھولے ہمارے منتظر تھے۔ مسٹر اور مسز فریزر ان کے ساتھ سامنے کی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کار کلب سے نکل کر ڈی اسٹیٹ کی سمت روانہ ہوئی۔ ارسلان بھائی اور مسٹر فریزر باتوں میں منہمک تھے۔

کچھ دیر بعد زرینہ نے شرلک ہومز کے سے خطرناک اور پُر اسرار انداز میں ہونٹ لٹکا کر اور آگے جُھک کے ذرا آہستہ سے کہا "مگر کمال ہے واقعی راحت تم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی۔ اور کیا عجیب حُسنِ اتفاق ہے۔"

میم نے مطلق کوئی جواب نہ دیا۔ گو اب اس کا بشاش بے تکلفی

کا لہجہ غائب ہو چکا تھا جس میں وہ اب تک ارسلان بھائی سے تبادلہ خیالات کر رہی تھی۔ "ہم لوگ کینیڈا واپس جائیں گے۔ تو آپ کا یہ حسین ملک بہت یاد آئے گا۔ حالانکہ یہ میرے وطن امریکہ سے کس قدر مختلف ہے۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ یہ امریکہ آج تک نہیں گئی۔" زرینے نے بہت آہستہ سے مجھے گوش گذار کیا۔ "مگر قسم خدا کی۔ واہ۔ واہ کیا قابل تعریف خود اعتمادی ہے۔ جواب نہیں۔"

ہم لوگ پو پھٹتے منزل مقصود پر پہنچے۔ وادی کے نشیب میں کرنل مورگن کے بنگلے پر امریکنوں کو اتار کر گھر کا رخ کیا۔

زرینہ کا بیحد خوبصورت اور شاندار بنگلہ چائے کے باغات میں گھری ایک نیچی سی پہاڑی پر استادہ تھا۔ اس کا ماحول خالص انگریزی تھا کیونکہ ارسلان بھائی سے قبل اس ٹی اسٹیٹ کے منیجر ہمیشہ انگریز ہوتے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور ڈرائنگ روم کے سرخ اینٹوں والے گہرے آتشدان میں آگ لہک رہی تھی۔ مختلف اقسام کے کتے ادھر ادھر محو خواب تھے۔ جگمگاتے سرخ روغنی فرشوں والے جھل جھل کرتے کمروں میں پھولوں کی افراط

تھی۔ غسلخانوں کے چینی کے ٹبوں کے نیلے پانی پر ربر کی بطخیں
تیر رہی تھیں۔ مسہریوں پر اصل لیس کے پلنگ پوش بچھے تھے۔
صبح کو بیرے نے برآمدے کے پھولوں سے گھرے کنج میں
بریکفاسٹ سرو کیا۔ دوپہر کے کھانے، شام کی چائے اور رات کے
کھانے کے وقت، میز کی چادر، نیپکین، برتن اور اسٹرلنگ سلور کے
چھری کانٹے ہر مرتبہ مختلف تھے۔ اب میں یہ توقع کر رہی تھی۔ کہ
ارسلان بھائی ڈنر سے پہلے ڈنر جیکٹ پہنیں گے زرینہ صبح کو برآمدے
میں بیٹھ کر خواتین کے ساتھ ماہ جونگ کھیلتی تھی یا دوسری خواتین
کے گھروں پر جا کر ماہ جونگ کی محفل منعقد کرتی تھی۔

"یا اللہ۔ زرینہ" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"کیوں۔ کیا ہوا" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"حد ہو گئی"

"مت بھولو کہ تمہارے لڑکپن تک تمہارے گھر کا بھی تقریباً
اسی قسم کا ماحول تھا"

"ہاں۔ مگر اب زمانہ کتنا بدل گیا ہے"

"کوئی نہیں بدلا ودلا"

"تم کام کیوں نہیں کرتیں؟"

کیسا کام؟"

"ارے اپنی ڈاکٹری اور کیا۔"

"یار" اُس نے خانساماں کو لنچ کا آرڈر دیتے ہوئے کہا "اب کیا ساری عمر فرض ہے کہ کولھو میں جُتے رہیں۔ نا بھائی، اب ہم بہت دنوں کام وام نہیں کریں گے۔ ہم تو بس ماہ جونگ کھیلیں گے۔ اور کلب کے چیرٹی بازار آرگنائیز کریں گے۔ ویسے اب میں ایک صحافی خاتون بھی بن گئی ہوں" اُس نے ذرا شرماکر انکسار کے ساتھ اضافہ کیا۔

"واقعی۔ یہ تو بہت عمدہ بات ہے" میں نے خوش ہوکر دریافت کیا۔ "مورننگ نیوز؟ پاکستان ٹائمز؟"

"نہیں۔ میں کراچی کے سوسائٹی ماہنامے "آئینہ" کے لئے سلہٹ ٹی گارڈنوں کا خبر نامہ لکھتی ہوں۔ کہ فلاں بیگم فلاں ڈنر میں نارنجی ساڑی پہنے بے حد چارمنگ لگ رہی تھیں۔ یو نو۔ دیٹ سورٹ آف تھنگ۔"

"آہا۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی ہنسی اور منھ لٹکا کر بیٹھ گئی۔ "آل فاؤنڈ۔ زندگی آل فاؤنڈ ہونی چاہئے۔ جیسی میری زندگی ہے" پھر

اُس نے یلکخت بڑے ڈراماٹی انداز میں کہا۔" میں ایک PARASITE خاتون ہوں۔"

" آپ ایک بوگس خاتون ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
یہ اتوار کا شگفتہ سہانا دن تھا۔ ہم بریکفاسٹ کے بعد سامنے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ میں نے ارسلان بھائی سے کہا تھا کہ میں ڈوکومنٹری کی تیاری کے سلسلے میں مزدوروں کے حالات جاننا چاہتی ہوں۔ اور اب ایک نمائندہ گروہ کا انتظار کر رہی تھی۔

" لو تمہارے مزدور آ گئے "۔ دفعتاً زرینہ نے کہا۔ میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مخملیں گھاس پر سے گذرتا پوربی مزدوروں کا ایک گروہ بنگلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

" اب تم شروع کرو اپنا انٹرویو۔" زرینہ نے بڑے اشتیاق سے کہا۔ مزدوروں کے مکھیا نے سیڑھیوں پر پہنچ کر ڈنڈوت اور پالاگن کیا۔ اس کے ساتھی زمین بوس ہو گئے۔ زرینہ نے متانت سے سر ذرا سا خم کر کے اُن کی بندگی کا جواب دیا۔ میں ہکا بکا اُسے دیکھا کی۔ میری کزن زرینہ جو لکھنؤ میڈیکل کالج کے لفٹ ونگ گروپ کی جوشیلی لیڈر رہ چکی تھی۔

مزدور مرد اور عورتیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ ذرا خائف سے نظر آرہے تھے۔ ارسلان بھائی ڈریسنگ گاؤن پہنے اندر سے نمودار ہوئے اور بید کی کرسی کھینچ کر اُن کے مقابل میں فروکش ہو گئے۔

" آہا - میں نے ان کو چڑا دیا۔" بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے ۱۹۳۲ء میں ضلع غازی پور کا انگریز کلکٹر اپنے دربار میں بیٹھا ہو۔"

" احمق۔" انھوں نے نیکدلی سے مسکرا کر کہا۔" اب پوچھو اُن لوگوں سے کیا پوچھنا ہے۔"

" تم لوگ - بارہ بنکی سے آئے ہو یا غازی پور سے کون ضلع سے آئے ہو۔" میں نے پوچھا۔

" سیتا پور سے بیگم صاحب۔" مکھیا اکڑوں بیٹھ گیا۔ اسکے چہرے سے تعجب اور پریشانی ہویدا تھی۔

" گھبراؤ نہیں رام نندن۔ تمھاری لکھا پڑھی نہیں ہوگی۔ یہ بٹیا بڑی دُور کراچی سے آئی ہیں۔ تم لوگوں کا سینما بنانے۔" ارسلان بھائی نے کہا۔

"سلیما-" ایک نوجوان نے خوش ہو کر کہا۔

" پھوٹو کھینچیے۔" عورتوں نے آپس میں سرگوشی کی۔

"تو کب آئے تم لوگ یہاں؟" میں نے سوال کیا۔

"بہوت جما نا ہوا۔"

"اتنی دور سلہٹ کیسے آئے؟"

"اسی کی کھاتر بیٹیا۔" بوڑھے مکھیا رام نندن نے اپنا پچکا ہوا پلیٹ بجایا "صاحب لوگ کاشی اور کلکتے جاتا تھا۔ مجور بھرتی کرنے اُس نے جنگل مابند وبست کیا۔ دکھل کیا۔ پھر سردار لوگ۔"

"سردار لوگ مزدوروں کے ہیڈمین تھے۔ گرُگے۔" ارسلان بھائی نے مکھیا کی بات کاٹ کر مجھ سے وضاحت کی۔ سو سال قبل انگریزوں نے مشرقی یو۔پی کے بھوکے ننگے کسانوں کو اپنے گرگوں کے ذریعہ یہاں بلوایا تھا چائے بگان میں کام کرنے کے لئے۔ یہ گرگے یا سردار انگریزوں کا دیا ہوا روپیہ خود رکھ لیتے تھے اور مزدوروں کو صرف دو وقت کی روٹی دیتے تھے۔"

ارسلان بھائی کی بات سن کر مکھیا نے سر ہلایا اور کہنا شروع کیا "سردار لوگ ہمرے باپ دادا کو اور ہم کو روٹی کپڑے کا لالچ دیکھہ ادھر لے آیا۔ او جمانے میں ریل کا رستہ نہ رہی۔ ہمرے باپ دادا ماٹی کاٹے رہن۔"

"مائی کاٹے رہن؟" میں نے دُہرایا۔

"ارے دادا پہلے باگ میں کام کریں پھر جاکر مائی کاٹیں۔ ریل بچھائے کھاتر۔" ایک بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

"رام نندن بٹیا کو سب کے نام بتاؤ پہلے" ارسلان بھائی نے کہا۔

"ہم رام نندن۔ ای ہمری بہن گُلجریا۔ ای ہمر لوچن۔ ای سکھ نندن۔ ای رام کرن۔ ای لس میتا۔ ای پاربتی" سب نے سر ہلائے۔ پاربتی ایک اٹھارہ سالہ سانولی سلونی لڑکی تھی اور بُری طرح لجا رہی تھی۔

"اسے تم اپنی فلم میں ضرور لو۔ بہت اچھا ناچتی ہے" زرینہ نے مجھ سے کہا۔ "بلکہ اپنا مرکزی کردار اسی کو بنا دو۔ بہت فوٹو جینیک ہے۔"

"اور تم یہاں کون کون تہوار مناتے ہو"۔ میں نے مکھیا سے دریافت کیا۔

"ارے اب رام لیلا نہیں ہوتا بیٹا۔ رام نومی۔ کھچڑی۔ ہولی۔ دیوالی کچھ نہیں ہوتا۔"

"کیوں — ؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے ارسلان بھائی کی طرف دیکھا۔
انھوں نے انگریزی میں کہا۔ "پھر بتاؤں گا۔"
پھر فلم میں مزدوروں کے بشاش تہوار کیسے دکھائے جائیں؟
خیر کچھ نہ کچھ ایڈجسٹ کر لیا جائے گا۔ میں نے سوچا۔
" اور تم ترلوچن ۔ ؟" میں نے ایک اور مزدور سے پوچھا۔
" ہم بٹیا دس سال کی عمر میں اعظم گڈھ سے آئے رہن ضلع
اعظم گڈھ۔ تھانہ چریا کوٹ، بڑا باپ مہاجن سے پچاس ساٹھ
روپیہ کرجہ لیا۔ مہاجن روپئے میں چھ آنے سود لیت رہا۔ بڑا
باپ اوا دا نہیں کر سکا تو مجوروں میں بھرتی ہو کر یہاں آ گیا۔
دس برس میں پچاس روپیہ جوڑ کر پھر دیس واپس گیا۔"
"کب کی بات ہے ؟" "جب فورڈ گاڑی نہیں چلی تھی۔"
" اور تم گلنزر یا ؟"
" ہم برٹش کے راج میں مرجاپور سے کلکتے آئے رہے۔
وہاں سے گوالندو گھاٹ آئیں۔ پھر ہمرا آدمی مار کھا گیا۔"
" پاکستان کب بنا تھا۔ یاد ہے ۔؟"
" پاکستان بنے تو ڈھیر دن ہو گیا بٹیا۔"
" بٹیا۔" مکھیا نے ذرا شرما کر کہا۔" ایک بات بتائیے۔ آپ

ہم لوگن کی بولی کیسے بول لیتی ہیں ؟"

"ایسے ہی رام نندن ۔" دفعتاً میں نے سوچا کہ اسکرپٹ کے لئے یہ انٹرویو بالکل بیکار ہیں ۔

مجھے خیال آیا کہ اُنیسویں صدی کے شروع میں لارڈ کارنوالس کے استمراری بندوبست کے بعد، مشرقی یو۔پی کے ہزاروں فاقہ کش کھیت مزدوروں کو جہازوں میں بھر بھر کے ایسٹ انڈیز، فی جی، ماریشس اور دوسرے ملکوں کو بھیجدیا گیا تھا جہاں وہ برطانوی پلانٹیشنز پر غلاموں کی طرح کام کرتے تھے اور آجتک اُن کی اولاد وہاں تقریباً اسی حالت میں موجود ہے ۔

کچھ دیر بعد مزدور واپس چلے گئے ۔ اسیوقت ایک سیاہ فورڈ کونسل آن کر رُکی جسے ایک کتھئی بالوں اور نیلی آنکھوں والی خوش شکل لڑکی ڈرائیور کر رہی تھی ۔ اس کے پہلو میں ایک سفید بالوں والی انگریز ضعیفہ بیٹھی تھیں ۔ اور تین بچے، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا پچھلی سیٹ پر آیا کے ساتھ براجمان تھے ۔ زرینہ ڈرائیو پر جا کے اس لڑکی سے باتیں کرنے لگی ۔ اور حسب معمول میری آمد کے واقعے پر روشنی ڈالی " یہ صنوبر ہے "۔ زرینہ نے مجھ سے کہا ۔" اور مسز ظفر علی صنوبر کی ممی "۔ ضعیفہ

شفقت سے مُسکرائیں۔

"ابّا کا خط آیا ہے وہ لوک سبھا کے لئے کانگریس ٹکٹ پر کھڑے ہو رہے ہیں۔" صنوبر نے زرینہ سے کہا۔ انگریز نژاد ہونے کے باوجود اس کا اُردو لب و لہجہ حیرت انگیز حد تک لکھنوی تھا۔

اتنے میں ایک اور کار اندر داخل ہوئی۔ چونکہ اتوار کی صبح تھی لوگ باگ ایکہ سرے پر کال کرنے یا سیر کرنے کے لئے نکلے تھے۔ یا اللہ کس قدر ELEGANT دُکھوں سے بے نیاز زندگی ہے۔ میں نے سوچا۔ نو وارد ایک اسکاٹش جوڑا تھا۔ اُنھوں نے زرینہ سے کہا کہ کرنل مورگن نے مسٹر اور مسز فریزر کے اعزاز میں رات کے ڈنر پر ہم سب کو مدعو کیا ہے۔ فریزر کل صبح چند روز کے لئے چنڈی چھیرہ ٹی اسٹیٹ، چاندپور بنگال چلے جائیں گے۔

"جاؤ گی؟" زرینہ نے صنوبر سے پوچھا۔

"نہیں۔" اُس نے مختصراً جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر کار اسٹارٹ کر دی۔

"اور تم اور ارسلان ـــ؟" مسٹر میلکم میک فرسن نے زرینہ

سے دریافت کیا۔

"میری کزن ہے" زرینہ نے حسب معمول وضاحت کی۔ "ہم لوگ مدّتوں بعد ملے ہیں۔ تین چار دن تک متواتر باتیں کریں گے۔ اس لئے فرصت نہ ہو گی۔"

مسٹر و مسز نیلکم میک فرسن کے جانے کے بعد میں نے صدر دفتر تار بھجوایا۔ "ٹی گارڈن ورکرز مائی نورٹی کمیونٹی کے کلچر میں اسلامی ماحول کس طرح دکھایا جائے۔ فوراً مطلع کیجئے۔"

اس کے بعد میں تار کے جواب اور ڈھاکہ سے کیمرہ مین کی آمد کے انتظار میں اطمینان سے بیٹھیں ہانکنے کے لئے بیٹھ گئی۔

رات کو کھانے کے بعد انرستان بھائی سونے کے لئے چلے گئے۔ میں اور زرینہ ڈرائنگ روم میں آگ کے سامنے بیٹھے سُوں سُوں کر رہے تھے۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ بنگال میں اتنا جاڑا بھی پڑ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ بیرے نے لکڑی کے کندے آگ میں ڈالے۔ اور کافی کی ٹرے بیگم صاحب کے سامنے حاضر کی۔ "بتیاں بجھا دو۔" زرینہ نے اُس سے کہا۔ وہ

روشنیاں بجھا کر اور پردے برابر کر کے دبے پاؤں باہر چلا گیا وسیع گھیرے کمرے میں اب صرف آتشدان کے شعلوں کی روشنی پھیل رہی تھی۔ قہوہ بناتے ہوئے جب زرینہ کا سایہ دیوار پر پڑا تو میں نے جانا کہ وہ شہرزاد کا سایہ ہے۔ اسلئے میں نے اس سے کہا "عزیزہ۔ کیا تم راحت کاشانی کے سلسلے میں کچھ روشنی نہیں ڈالوگی۔"

اسکرپٹ کے کاغذات قریب ایک تپائی پر پڑے تھے۔ اُن پر ایک نظر ڈال کر اُس نے کہا "ہاں" میں پرچھائیں کو دیکھتی رہی جس کے ہونٹ ہلے اور داستان شروع ہوئی۔

"فلیش بیک — اے خوش خصال، نیک خو، پریدہ مو عزیزہ ۔ عشق ہے تازہ کار تازہ خیال۔ ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال۔ کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے۔ کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے۔

"سبحان اللہ" میں نے کہا۔

"بی بی۔ بلبلِ نوا سنج ہزار داستاں طوطیِ زمزمہ ریز خوش بیاں گلشنِ تقریر میں یوں چہکا ہے کہ عرصہ پچیس ۲۵ سال کا ہوا کہ عروس البلاد کلکتہ میں تین دوست رہتے تھے کہ تینوں

ایک جان تین قالب تھے۔ نام اُن کے شمشاد، قاسم اور واجد تھے، تینوں مشرقی یو۔پی کے ایسے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے جو عرصۂ دراز سے کلکتے میں بود باش اختیار کر چکے تھے۔ تینوں نے پریذیڈنسی کالج میں اکٹھے پڑھا اور جنگ شروع ہوئی تو شمشاد اور واجد اکٹھے ہی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ شمشاد کا تقرر شیلانگ میں ہوا۔ وہ ان تینوں میں سب سے بڑا تھا۔ واجد کی محاذ سے لوٹنے کے بعد کلکتے میں پوسٹنگ ہوئی۔ قاسم جو انجنیئر تھا دوسرے میں ملازم ہو گیا۔ اب اس معبودِ حقیقی کی مصلحتوں کے قربان جائیے کہ شیلانگ میں ڈاکٹر ظفر علی بھی رہتے تھے کہ جو درحقیقت باشندے لکھنؤ کے تھے مگر مدت مدید سے آسام میں پریکٹس کر رہے تھے۔ انکی بیوی انگریز تھیں اور اکلوتی لڑکی صادقہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ میجر شمشاد نے جب صادقہ کو دیکھا تو ہزار جان سے اُس پر عاشق ہو اور فوراً پیغامِ مناکحت اس کے والدین کو بھجوایا۔ ڈاکٹر ظفر علی میجر شمشاد کے گھر والوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور لڑکا نہایت معقول تھا۔ لہٰذا پیغام منظور کر لیا گیا۔ اور صادقہ نے ابھی سینیئر کیمبرج بھی نہ کیا تھا کہ اُس کی شادی

میجر شمشاد سے ہو گئی جو پرستش کی حد تک اسے چاہتا تھا۔ اپنے نام کی مناسبت سے اس نے اپنی لاڈلی بیوی کا نام صنوبر رکھا اور دونوں ہنسی خوشی زندگی گذارنے لگے۔ چھٹیاں گذارنے کے لئے واجد اور قاسم بھی کلکتے سے شیلانگ یا دارجلنگ آجاتے۔ صنوبر سگھڑ بھاوج کی حیثیت سے اُن کی خاطریں کرتی اور دونوں کے بیاہ کے لئے لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی۔ لیکن جب صنوبر کو معلوم ہوا کہ قاسم کی شادی ہو چکی ہے اور اُس کی بیوی پٹنہ اپنے میکے میں رہتی ہے تو اسے بڑا غصّہ آیا کہ اس نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ تس پر قاسم نے قہقہہ لگا کر خوب اسے بنایا۔ اور اس کی سہیلیوں کے لئے طرح طرح کے مذاق کئے قاسم تم سمجھ گئی ہو گی کہ ایک بہت دلچسپ نوجوان تھا۔

"رہ گیا واجد۔ تو اب کچھ عرصے سے وہ شادی کے نام پر چپ ہو جاتا۔ قاسم صنوبر سے کہتا کہ یہ بڑا اگھاگ ہے۔ اس نے کلکتہ میں کوئی سلسلہ شروع کر دیا ہے۔ اور شمشاد جو ایک بیحد محبّت بھرے دل کا مالک تھا اپنے دونوں دوستوں کو سگے بھائیوں سے زیادہ سمجھتا تھا۔

"اب میں تم کو ایک بات بتادوں،" زرینہ نے شال لپیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ چاروں، شمشاد، صنوبر، قاسم اور واجد سب ہی اوسط درجے کے لوگ تھے۔ ان کو کتابوں سے خاص دلچسپی نہ تھی۔ سیاسی شعور یا آرٹ وارٹ سے کوئی ربط نہ تھا۔ ہلکے پھلکے لوگ تھے۔ جو اس طبقے میں ہر جگہ نظر آتے ہیں، اچھی ملازمتیں، مستقبل کی ترقی اور آسائش اُن کی زندگیوں کے محور تھے۔ صنوبر بھی سیدھی سادی لڑکی تھی اور خود کو بہت گھسٹے کی لکھنوی بیگم سمجھنے کی شوقین تھی۔ قصہ کوتاہ چاروں اپنی اپنی جگہ بہت شریف اور ڈھنگ کے لوگ تھے۔ ان میں آوارہ یا گھٹیا کسی کو نہیں کہا جاسکتا۔

"پھر صنوبر اور شمشاد کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور انکی ازدواجی مسرت کی تکمیل ہوگئی، کئی سال گذر گئے۔ جنگ کے اخیر دنوں میں شمشاد قاہرہ بھیجدیا گیا۔ قاسم ایک جہاز راں کمپنی میں کام کرہا تھا۔ شمشاد قاسم سے کہتا گیا کہ وہ وقتاً فوقتاً آکر صنوبر کی خبر گیری کرتا رہے۔ جو شیلانگ میں تھی۔

"اس دوران میں یعنی شمشاد کی غیر موجودگی میں وہی ہوا جس کے لئے رومانی ناولوں کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ دونوں

ایکدوسرے کے بیحد قریب آ گئے ۔ اور جب شمشاد مغربی محاذ سے لوٹ کر آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی اور اس کے لاڈلے دوست کے درمیان ایک بہت گہرا جذباتی رشتہ قائم ہو چکا ہے۔

"شمشاد بڑا اصول پرست، کم گو، اور ٹھوس بلکہ ٹھس قسم کا انسان تھا۔ جب یہ قصہ چھاؤنی میں اسکنڈل بن کر گشت کرنے لگا تو اس نے سروس پستول نکال کر ارادہ کیا کہ پہلے صنوبر کو مار ڈالے اور پھر خود کو ہلاک کر دے۔ صنوبر نے اس سے طلاق مانگی مگر وہ تو مارنے مرنے پر تلا ہوا تھا۔

"دارجلنگ اور کلکتے سے دونوں کے والدین نے آ کر صلح صفائی کرائی اور صنوبر نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اب وہ قاسم سے نہیں ملے گی۔ شمشاد چونکہ ایک اصول پرست اور راستباز انسان تھا اس نے بیوی کی قسم پر اعتبار کیا۔ مگر ہوا یہ کہ اب صنوبر اور قاسم دریائی راستوں پر، خالی اسٹیمروں اور تنہا ڈاک بنگلوں میں چھپ چھپ کر ملنے لگے کہ آسام اور بنگال کے گھنے رومینٹک جنگل اور دریا اس طرح کی ملاقاتوں کے لئے بیحد آئیڈیل ہیں۔

"صنوبر کا بچہ اب چار سال کا ہو چکا تھا۔ شمشاد بچے پر بھی

عاشق تھا اور صنوبر کو، اس کی حرکتوں کے باوجود اب بھی بیحد چاہتا تھا۔

" ایک دن اگرتلہ گھاٹ پر اس نے صنوبر اور قاسم کو اکٹھے دیکھ لیا اور جب صنوبر شیلانگ واپس پہنچی تو اس کی بُری طرح ٹھکائی کر ڈالی۔ صنوبر نے دوبارہ طلاق کا مطالبہ کیا اور پہلے سے زیادہ مار کھائی۔

" اس مار پیٹ کا سلسلہ بہت دنوں تک چلتا رہا آخر ایک رات جب شمشاد باہر گیا ہوا تھا صنوبر نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔

" اُس رات چھاجوں مہینہ برس رہا تھا۔ آسام کی برسات کی رات، تم نے دیکھی ہے ــ؟ جو محبت کرنے والوں کے لئے قیامت آفریں اور نامُرادوں کے لئے پیغامِ ہلاکت بن کر آتی ہے چنانچہ صنوبر نے بچے کو بہت سی ٹافی دیکر اور جی بھر کے رونے اور پیار کرنے کے بعد آیا کے ساتھ شاگرد پیشے میں بھیجدیا۔ اور پھر اُس نے ایک پرچہ لکھا: "تم مجھے علیحدہ کرنے پر تیار نہیں۔ اور قاسم کے بنا زندہ رہنے کا اب میرے لئے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس جانکنی کی تکلیف سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی راستہ مجھے سُجھائی دیا ہے۔

بھیّا کا خیال رکھنا۔ خدا حافظ، یہ دلدوز خط لکھنے کے بعد اُس نے بچّے کے کھلونوں، جوتوں اور کپڑوں کو بلک بلک کر پیار کیا۔ پھر آنسو پونچھ کر پرچہ شمشاد کے سرہانے کی میز پر رکھا۔ خواب آور گولیوں کی شیشی الماری سے نکالی اور گلاس میں پانی انڈیلا۔

"عین اسی وقت بیڈ رُوم کا دروازہ بھڑ سے کھُلا ـــ"

" زرینہ تمہارا جواب نہیں" میں نے داد دی" اس قدر جان لیوا کلائمکس کی آپ منظرکشی فرما رہی ہیں اور کیا بھڑ سے دروازہ کھولا ہے سبحان اللہ"

" سنو تو چپکی بیٹھی ـــ تو جناب دروازہ کھُلا اور کودتا پھاندتا بھیّا تیر کی طرح اندر داخل ہوا اور صنوبر دھک سے رہ گئی۔ بچّے نے ماں کی ٹانگوں سے لپٹ کر کہا "ممّی۔ ممّی۔ ذرا یہ فیتہ باندھ دو، مجھ سے بندھ نہیں رہا" اور اپنی مُنّی سے کلائی پیش کر دی۔ گلابی پلاسٹک کی مصنوعی گھڑی اس کے دوسرے ہاتھ میں تھی جو اُسے غالبًا آیا نے تحفتًا دی تھی۔

" اس لمحے، اپنے بیٹے کو دیکھ کر وہ موت کو یکسر بھول گئی اور زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ خط پھاڑ کر پھینک دیا اور شمشاد کے لئے

کھانے کی دیکھ بھال کرنے باورچی خانے میں چلی گئی۔

"لیکن صبح کو اس نے شمشاد کے دفتر جانے کے بعد اسباب باندھا اور بچے کو ساتھ لیکر دارجلنگ روانہ ہوگئی وہاں اس نے اپنے والد ڈاکٹر ظفر علی کے ہاتھ پاؤں جوڑے کہ وہ خلع حاصل کرنے میں اس کی مدد کریں۔ وہ ایک نہایت وضعدار آدمی ہیں۔ انھوں نے اسے خاندانی عزت اور اپنے سمدھی سے اپنی چالیس برس پرانی دوستی کا واسطہ دیا۔ اور اس سے التجا کی کہ وہ شمشاد کے پاس واپس چلی جائے۔ کیونکہ یہ واقعہ تھا کہ قصور سراسر صنوبر کا تھا۔ شمشاد اس کے لئے آئیڈیل شوہر ثابت ہوا تھا۔ مگر ہے یہ وہ آتش غالب۔ وغیرہ وغیرہ چنانچہ صنوبر کلکتے گئی اور چند دوستوں کی مدد سے عدالت میں خلع کی درخواست دیدی۔ مقدمے نے نہایت طول کھینچا یہاں تک کہ تقسیم ہند کا زمانہ آن پہنچا۔ تقسیم کے چند ماہ بعد صنوبر نے خلع حاصل کرلیا۔ لیکن اسے اپنے بچے سے دستبردار ہونا پڑا۔ بچہ اب اپنی دادی اور پھوپھیوں کے ساتھ ڈھاکے میں تھا جہاں شمشاد کے گھر والے کلکتے سے ترک وطن کرکے آچکے تھے۔ شمشاد کچھ عرصے بعد فوج سے ریٹائر حاصل کرکے کسی قسم کی اعلیٰ ٹریننگ حاصل کرنے امریکہ چلا گیا۔ کلکتے میں صنوبر اور قاسم کی شادی ہوگئی۔

"بی بی - اب یہ نکتہ یاد رکھو کہ قاسم نے اپنی پہلی بیوی کو جو مستقل ٹینے میں رہتی تھی - طلاق نہیں دی تھی - کیونکہ وہ اس کے سگے چچا کی اکلوتی اور صاحب جائیداد لڑکی تھی - اب قاسم کی دوسری شادی نے جائیداد کے سلسلے میں بھی قانونی پیچیدگیاں پیدا کر دیں اور اس کے چچا یعنی سسر نے اس پر دعویٰ دائر کر دیا - جانے کیا قضیہ تھا - اس کی مجھے تفصیل معلوم نہیں - ان سب مصیبتوں سے بچنے کا بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ ہندوستان کو خیر باد کہے چنانچہ اس نے آسام کی جہاز راں کمپنی سے اپنا تبادلہ مشرقی پاکستان کی ایک جہاز راں کمپنی میں کروا لیا - اور دونوں دولہا دلہن ڈھاکے آ گئے -

" واجد بھی کلکتے سے اوپٹ آوٹ کر کے ڈھاکے آ چکا تھا اور فوج چھوڑنے کے بعد ایک سول ملازمت میں شامل ہو گیا تھا -

" ڈھاکے میں صنوبر نے اپنا نیا گھر بھی اسی خوش سلیقگی اور نفاست سے سجایا جس طرح وہ آسام میں اپنے بنگلے دلہن کی طرح سجائے رکھتی تھی - وہ ایک بڑی مرنجان مرنج اور خاموش طبیعت لڑکی ہے - اور اسے دیکھ کر کسی کو یقین نہیں آ سکتا تھا کہ اس نے سر پر کفن باندھ کر ایسا طوفانی اور بلا خیز عشق کس طرح کر ڈالا تھا - بہر حال اب وہ بیگم شمشاد کے بجائے بیگم قاسم تھی اور بیحد مسرور تھی -

"واجد ملازمت کے سلسلے میں نارائن گنج میں مقیم تھا مگر ویک اینڈ گذارنے کے لئے صنوبر اور شمشاد کے یہاں آجاتا تھا۔ صنوبر اسکے پیچھے پڑ گئی کہ پاکستان بننے کے بعد ڈھاکے میں سارے برصغیر سے آئے ہوئے اچھے اچھے خاندانوں کی ریل پیل ہے اور ایک سے ایک خوبصورت لڑکیاں یہاں موجود ہیں۔ اب اسے ضرور بیاہ کر لینا چاہیئے۔ مگر واجد حسب سابق اس کی بات ہنس کر ٹال جاتا۔ اور قاسم صنوبر کو یاد دلاتا کہ واجد بڑا گھاگ ہے اس کا کلکتہ والا سلسلہ ابھی تک غالباً چل رہا ہے۔ یہ پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیگا۔" اس بات پر واجد معنی خیز نظروں سے اسے دیکھ کر کہتا ابے چپ ہو جا یار۔ اگر اپنی خیریت چاہتا ہے۔ اس پر دونوں دوست خوب قہقہہ لگاتے اور صنوبر اس پُر اسرار مذاق کو نہ سمجھ پاتی مگر خود بھی ہنسی میں شامل ہو جاتی۔

" اکثر وہ بچے کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کار لے جا کر اسکے اسکول کے باہر کھڑی کر دیتی اور بچے باہر نکلتے تو صبر سے اپنے بیٹے کا انتظار کرتی رہتی۔ مگر جب وہ قریب سے گذرتا تو جلدی سے آنچل منہ پر ڈال کر کار اسٹارٹ دیتی۔ اسے معلوم تھا کہ شمشاد نے بچے سے کہہ رکھا ہے کہ اس کی ممّی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اسکول سے لوٹ کر

وہ پہروں روتی۔ تب قاسم اس پر برس پڑتا۔

"علامہ راشد الخیری کی اس ٹریجک ہیروئن نے خدا کی قسم اب مجھے بور کر دیا ہے" وہ کہتا۔ وہ اور زیادہ بلک بلک کر رو دیتی۔ تب واجد اسے بڑے پیار سے سمجھاتا۔ "تم اپنی کشتیاں جلا چکی ہو۔ اب قاسم سے لڑائی جھگڑے شروع نہ کر دینا۔ کہیں کی نہ رہو گی۔ وہ مزید روتی اور واجد اسے مزید دلاسے دیتا۔

"پھر یہ ہوا کہ صنوبر کے یہاں توام لڑکیاں پیدا ہوئیں اور وہ بیٹے کی مفارقت کا دکھ بھول کر اُن بچوں میں محو ہو گئی۔ ڈاکٹر ظفر عسکری شیلانگ میں تھے۔ اور صوبائی سیاست میں نمایاں حصّہ لے رہے تھے۔ صنوبر کی والدہ شیلانگ سے آکر ڈھاکے میں بیٹی داماد کے پاس قیام کرتیں اور نواسیوں سے لاڈ پیار میں لگی رہتیں۔ یوں، خاصی مطمئن اور خوش باش زندگی صنوبر اور قاسم کی گذر رہی تھی۔

"پھر ایک بیحد معمولی سا واقعہ ہوا بی بی۔ تم وقت کی بات جو کرتی ہو تو میری سُنو۔

"ایک چھوٹا سا سفر۔ ایک بظاہر غیر اہم مُلاقات، ایک منظر کی سَرسَری جھلک، ایک مختصر سا خط، ایک تحریر، بے دھیانی میں کہے ہوئے چند الفاظ — زندگی کا دھارا بدل دیتے ہیں۔ ایک لمحہ نجم

کو جنّت اور جنّت کو جہنم میں تبدیل کرنے پر قادر ہے ایک لمحہ۔ صرف ایک لمحہ۔ بی بی۔

" ایک روز قاسم نے دفتر سے گھر آکر صنوبر سے کہا کہ اسے ایک سرکاری وفد کے ساتھ بمبئی بھیجا جا رہا ہے۔ کسی کانفرنس کے لئے۔ اور اس نے صنوبر کو الٹی میٹم کو دیا کہ وہ فوراً تیار ہو جائے۔ صنوبر بمبئی کی سیر اور شاپنگ کے خیال سے کھل اٹھی۔ بچیوں کو اپنی والدہ کے حوالے کیا اور خوش خوش طیارے میں بیٹھ کر قاسم کے ساتھ بمبئی پہنچی۔

" وفد کے ارکین تاج محل ہوٹل میں ٹھہرائے گئے۔ ایک رکن نے اپنے ایک مقامی دوست سے کہا کہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ دیکھنا اور نرگس سے ملنا چاہتے ہیں۔ مقامی دوست نے جواب دیا کہ وہ ابھی اپنی دوست مسز سروپ کمار کو فون کیے دیتے ہیں۔ وہ آپ سب کو نگارخانوں کی سیر بھی کرا لائیں گی، اور نرگس، راج کپور، دلیپ کمار۔ سب سے ملوا بھی دیں گی - اور بیگم قاسم! انھوں نے صنوبر کو مخاطب کیا۔ مسز سروپ کمار اور ان کی ہمشیرہ مس کاشانی ساریاں خریدنے کے سلسلے میں آپ کی بہترین گائیڈ ثابت ہونگی۔"

لہٰذا اُن دونوں خواتین کو فون کیا گیا اور صنوبر اُن کے ساتھ

باہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

"تب ایک عجیب بات ہوئی۔ قاسم نے اچانک اُس سے کہا کہ اسے ان لوگوں کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کانفرنس سے لوٹ کر شام کو اُسے خود باہر گھما لائے گا۔ صنوبر نے اپنے اکسائیٹمنٹ میں اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ تو نرگس اور مینا کماری کی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے کے لئے مری جا رہی تھی۔ چنانچہ قاسم اور دوسرے پاکستانی انجینیر کانفرنس کے لئے روانہ ہو گئے کچھ دیر بعد ایک تازہ ترین ماڈل کی امریکن کار تاج کے سامنے آن کر رُکی اور دو بیحد فلیشن ایبل لڑکیاں ہنستی کھلکھلاتی اتریں اور صنوبر سے جو اُن کے انتظار میں برآمدے میں کھڑی سمندر اور جہازوں کو دیکھ رہی تھی، اپنا تعارف کرایا۔ فرحت مروپ کمار اور راحت کاشانی۔

"بی بی۔ اس نکتے پر پہنچ کر یہ خاک ار ایک دوسرا فلیش بیک شروع کرتا ہے یعنی فلیش بیک در فلیش بیک۔ صنوبر کی کہانی اس نکتے تک ذہن میں محفوظ رکھو۔ کس نکتے تک؟"

"کہ دو بیحد فیشن ایبل لڑکیاں تاج کے سامنے آکر اتریں" ملوں نے فرماں برداری سے جواب دیا۔

"ہاں۔" زرینہ نے گلا صاف کیا۔ اور نئی کافی تیار کرنے کے بعد کہانی جاری رکھی۔

"تم کو یاد ہوگا بی بی۔ جب ابّا میاں کا تبادلہ لکھنؤ سے کلکتے کا ہوا تھا تو میں انٹر سائنس کے لئے لیڈی برابورن کالج میں داخل ہوگئی تھی۔ یاد ہے نا؟ اچھا۔ تو ایک مرتبہ کیا ہوا کہ ہم کالج میں ایک ہندوستانی ڈرامہ اسٹیج کرنے والے تھے۔ تو ہماری ایک ہم جماعت انجم آرا نے کہا کہ اس کے ماموں کے ایک دوست ہیں واجد صاحب واجد صاحب کر کے۔ ان واجد صاحب کی ایک بیحد گلیمرس گرل فرینڈ ہے جو بہت اچھی ایکٹرس ہے۔ اور شہر کے تھیٹریکل حلقوں میں اسکی ڈائریکشن کی صلاحیتوں کو بھی بہت سراہا جا رہا ہے۔ میں اُسے بلواتی ہوں کہ ہماری مدد کرے۔

"اب یہ اتنا لمبا چوڑا تعارف دراصل ایک ایسی حسینہ نازنین کا تھا جو کلکتہ میں تو بیحد مشہور تھی مگر بسم اللہ کے گنبد میں پلی ہوئی ہم بیوقوف اور نوعمر لڑکیوں کے لئے اسوقت تک اسکا نام اجنبی تھا۔ یہ زہرہ جبین فخر لعبتانِ لندن و چین ماہرو عنبرین موسر گروہ خوبان جہاں جانِ جہاں آرام دل دلِ مشتاقاں کہ نام اس کا راحت کاشانی تھا۔ سال بھر قبل کوئٹے سے آئی تھی، اور وار پبلسٹی کے

محکمے میں اسسٹنٹ انفرمیشن آفیسر بقول شخصے لگی ہوئی تھی۔
" اس کے بارے میں طرح طرح کی رومانٹک روائتیں مشہور ہوگئی تھیں۔ جن کی وجہ سے اس نے سارے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔
" مس کاشانی کی دوسری تہلکہ خیزی کی وجہ ایک اور تھی۔"
" مجھ کو خوشی ایک اور ہے لانا تو ادہ ایک جام مے

ہاں ہاں مسلمان زادیاں ہوتی ہیں عفت والیاں
چشم فلک نے آج تک دیکھی نہ ان کی اک جھلک" میں نے
زرینہ کی بات کاٹ کر آنکھیں بند کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور "جھلک" اتنے زور سے ادا کیا کہ زرینہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ پھر اس نے اسی روانی سے کہانی جاری کر دی ۔" وجہ ایک اور تھی۔"
آج برصغیر اتنا آزاد ہو چکا ہے ماشاءاللہ سے۔ اور اب یہ انوکھی بات نہیں رہی۔ مگر اسوقت تک وطن عزیز اسقدر ماڈرن نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ حسینہ نازنین کلکتے کے لوئیر سرکلر روڈ کو پیرس کا لیٹن کوارٹر گردانتی تھی اور واجد صاحب کے ساتھ رہا کرتی تھی۔
"چنانچہ آئندہ اتوار کو ہمارا ڈرامہ گروپ زوآلوجیکل گارڈن میں

ایک جھیل کے کنارے کنج میں جمع ہوا اور وقت مقررہ پر مس کاشانی وہاں تشریف لائیں۔ ڈرامے کی پہلی ریڈنگ کروائی۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ ڈرامہ عصمت آپا کا "خالہ بی" تھا، اور بڑے وقار اور متانت سے ہم لونڈیوں سے باتیں کرتی رہیں۔

"دوسرے اتوار کو ہم کالج ہال میں ریہرسل کے لئے اکٹھے ہوئے مگر مس کاشانی نہ آئیں۔ کچھ دیر بعد انجم آرا نے منہ لٹکائے ہوئے آکر خبر دی کہ ایک بڑا واقعہ ہو گیا ہے۔ راحت آپا واجد چچا کے والدین کے گھر گئی تھیں وہاں واجد چچا کی بہنوں نے ان پر چوری کا الزام لگا کر ان کو مکان سے نکال دیا۔

"گڈ گاڈ۔ آل مائٹی جیزس۔ گڈنس گریشس۔ حیرت زدہ آوازوں کا کورس بلند ہوا۔

"مگر چوری کا الزام کیوں۔؟" میں نے پوچھا۔

"حالانکہ تم کو پتہ بھی ہے، راحت آپا قلات کے فقیروں کی بیٹی ہیں۔؟" انجم آرا نے کہا۔

"فقیروں کی۔ یعنی صوفیوں کی؟" میں نے پوچھا۔

"ارے نہیں بھائی۔ فقیر جو رنگ برنگی مالائیں پہنے درگاہوں میں بیٹھے اللہ اللہ کرتے ہیں۔ اور چمن۔ بوستاں اور زاہداں میں راحت آپا

کے والد کے ذاتی تاکستان ہیں۔

"اوہ ہاؤ ویری فیبیولس،"

"لیکن راحت آپا کی امّی خانہ بدوش ہیں۔" انجم آرا نے بڑے ڈرامائی انداز میں دوسری اطلاع دی۔ "یعنی جپسی۔ اور فورٹ سنڈیمن اور لورالائی سے لیکر تربت تک ان کے قبیلے کے کاروانوں کی گھنٹیاں صحرا کی چاندنی میں گونجتی رہتی ہیں۔ راحت آپا کے نانا بلوچی خانہ بدوشوں کے سب سے بڑے قبیلے کے سب سے بڑے سردار ہیں۔ اور بیحد دولتمند۔ اونٹوں گلّے۔ اور جناب ایرانی قالینوں سے سجے ہوئے خیمے اور تلواریں بندوقیں۔ مگر واجد چچا کی بہنوں نے یہ سب نظر انداز کر کے طعنہ دیا کہ تم آخر ہو کون۔ اٹھائی گیری۔ اچکّی۔ اِدھر اُدھر ڈاکے ڈالتی پھرتی ہو۔ تباہ و برباد کر ڈالتی ہو لوگوں کو۔ اب بتاؤ بھلا! بے چاری راحت آپا کو لیکے چور ڈاکو بنا دیا۔"

"ہم سب راحت کا شانی کے اس الف لیلوی لیس منظر سے مسحور ہو گئے اور ببانگ دہل اعلان کیا کہ واجد چچا کی بہنوں کو ایسی غلط اور افسوسناک بات ہرگز نہ کہنا چاہئے تھی۔"

"راحت کاشانی ایکدم غائب ہو گئیں اور "خالہ بی" ان کے

ڈائریکشن سے فیضیاب نہ ہو سکا۔ لیکن ڈیڑھ دو مہینے بعد ایک صبح انجم آرا نے لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی اطلاع دی کہ راحت نے مٹیا برج کے ایک انتہائی لوفر نوابزادے سے شادی کرلی اور اس کے چار دن بعد ہی اس سے طلاق لے لی۔ اس حیرت انگیز واقعے کی وضاحت انجم آرا نے یوں کی کہ راحت نے واجد چچا سے کہا کہ وہ اس سے شادی کرلیں۔ مگر واجد چچا نے منع کردیا۔ اور کہا کہ وہ اس سے محبّت کرتے ہیں مگر اس کی عزّت نہیں کرتے۔

" ' مجھے بتاؤ زرینہ۔ انجم آرا نے مجھ سے پوچھا' اس کا کیا مطلب ہوا؟ محبّت کرتے ہیں عزّت نہیں کرتے ۔۔ '؟

" ' بھئی اس کا یہی مطلب ہوا کہ آدمی اس لڑکی سے شادی کرتا ہے جس کے لئے اس کے دل میں عزّت ہو۔ '

" ' مگر پھر محبّت کیوں کرتے ہیں '؟

" یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ ہم لوگ اُس وقت کتنے بھولے اور احمق تھے۔ آج کل کی لڑکیوں کو دیکھو۔ گھاگ ایک سے ایک ۔۔ "

" اچھّا زرینہ بی بی تم اپنے فٹ نوٹ نہ دو۔ قصّہ سناؤ۔" میں نے گھڑی دیکھی۔" مجھے صبح سویرے لوکیشن ڈھونڈنے جانا ہے"

"اچھا اچھا رعب مت ڈالو۔ ہاں تو میں کیا بتا رہی تھی۔؟"

"لوفر نوابزادے سے طلاق لے لی۔"

"ہاں۔ اور ٹالی گنج میں فلیٹ لے لیا۔ کیونکہ اب اس کی چھوٹی بہن فرحت بھی کالج کی تعلیم ختم کر کے کوئٹے سے کلکتے آگئی تھی۔ فرحت کافی معمولی شکل کی لڑکی تھی مگر انجم آرا نے کہا کہ چھوٹے ماموں کہتے ہیں فرحت کا شانی میں گھڑوں سیکس اپیل ہے۔

"اب دونوں بہنوں نے مل کر شہر کو انگریزی محاورے کے مطابق سرخ رنگ دیا۔"

"انہی دنوں قاسم جو دریائی ملازمت کے سلسلے میں آسام میں تھا کلکتے آیا۔ اس وقت صنوبر سے اس کا عشق شروع نہیں ہوا تھا۔ کسی محفل میں فرحت کاشانی سے اس کی ملاقات ہوئی اور فرحت اس کی محبوبۂ دلنواز بن گئی۔ پھر وہ شیلانگ گیا، اور شمشاد کی غیر حاضری میں صنوبر سے عشق کرنے لگا۔ مگر ہر مرتبہ جب وہ کلکتے آتا تو فرحت بھی اس کی رفاقت کرتی۔ جب تک صنوبر سے شادی کر کے وہ ڈھاکے نہیں گیا اس وقت تک فرحت کلکتے ہی میں رہی۔ لیکن صنوبر کو اس کے وجود کا مطلق علم نہ تھا۔ (حوالے کے لئے پچھلا فلیش بیک یاد کرو)

' پھر ثنا بی بیں انٹر سائنس کر کے لکھنؤ میڈیکل کالج چلی گئی۔
" ایک روز ریڈنگ روم میں ایک فلمی رسالے پر نظر پڑی تو اس میں راحت کا شانی کی متبسم تصویر موجود تھی۔
" اب آگے کا سنو احوال۔
" تقسیم ہند کے فوراً بعد انجم آرا شادی کر کے لکھنؤ آگئی اور اس نے بتایا کہ واجد چچا ڈھاکے چلے گئے ہیں اور راحت اور فرحت نے بمبئی جا کر فری لانسنگ شروع کر دی ہے۔
" کا ہے کی فری لانسنگ؟' میں نے بیوقوفوں کی طرح پوچھا۔
" ' اداکاری اور دیگر فنون لطیفہ' انجم آرا نے بڑے ٹھاٹ بن سے جواب دیا۔ شادی سے پہلے کتنی معصوم تھی یہ بچی۔ میں نے سوچا۔
" ' وہ دونوں فلمی دنیا میں اس طرح داخل ہو گئی ہیں جس طرح بطخ پانی میں تیرنے لگتی ہے لیکن بد قسمتی سے ان کی شکلیں کیمرے کے لئے موزوں نہیں ہیں اس لیے بڑی فلم اسٹار کبھی نہ بن سکیں گی۔ انجم آرا نے کہا۔
" آزادی کے بعد دونوں ملکوں میں نیا دولتمند طبقہ ابھرا حصول زر جن کا واحد آدرش تھا اور جو ہر قسم کی تہذیبی اور اخلاقی اقدار سے بے بہرہ اور بے تعلق تھا۔ شراب نوشی، فیشن ایبل عیاشی

اور ریا کاری کے اس عظیم الشان دور نے ایسی روایات کو جنم دیا جن کے آگے بے چاری راحت کا ثانی بھی ماند پڑ گئی اب راحت اور فرحت کا ٹائپ انوکھا نہیں رہا تھا۔

"اسی زمانہ میں سُردیپ کمار جو بمبئی میں بڑا سخت فلمی ہیرو لگا ہوا تھا۔ فرحت کے عشق میں گرفتار ہوا۔ اور اس سے سول میرج کر لی۔ راحت نے ایک غیر فلمی ہیرو سے گویا گندھرو واہ کر لیا اور مسز غیاث الدین کہلانے لگی۔ پھر یکایک مسٹر غیاث الدین انگلستان چلے گئے۔ راحت بمبئی کے ترقی پسند حلقے سے بھی ربط رکھتی تھی اور جب غیر ملکی فلمی یا تہذیبی وفد شہر میں وارد ہوتے تو راحت ہی انکے استقبال میں پیش پیش رہتی۔ مگر فلم انڈسٹری کے اندر اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ اس کے لیے بہت بڑا المیہ تھا۔ احمق الذہن، خالی الذہن لڑکیاں چوٹی کی فلم اسٹار بن کر لاکھوں کما رہی تھیں اور ایک عالم میں مشہور ہو گئی تھیں مگر راحت اپنے غیر معمولی حسن، ذہانت، فنی صلاحیت اور اخلاقی آزادروی کے باوجود کچھ نہ بن سکی۔ اس احساس محرومی اور ناکامی کی تلافی کے لیے وہ تلوار کی دھار پر سے گذر گئی۔

"پھر سُردیپ کمار ایک فلمی ڈیلی گیشن کے ساتھ

جاپان چلا گیا اور اپنی بہن کی دوسرا تھ کے لیے راحت سروپ کمار کے نیپین سی روڈ کے عالیشان فلیٹ میں آن کر رہنے لگی۔ اسروپ کمار نے متعدد ریس کے گھوڑے، اور دولاکھ روپیہ بھی فرحت کے نام منتقل کر دیا تھا۔ اس میں بیوی کی چاہت اور انکم ٹیکس سے بچنے کی ترکیب دونوں مضمر تھے۔

"ایک روز فرحت صوفے پر لیٹی آیا سے پاؤں دبوا رہی تھی اور راحت نیچے قالین پر اوندھی لیٹی کچھ پڑھ رہی تھی کہ سفید رنگ کے فون کی گھنٹی بجی اور تاج محل ہوٹل سے ایک دوست نے کہا کہ ڈھاکے سے کچھ مہمان آئے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ فوراً آؤ۔ چنانچہ دونوں بہنیں پریوں کی طرح سج کے تاج روانہ ہو گئیں اور وہاں پہنچکر صنوبر قاسم کو اپنا منتظر پایا۔

"آٹھ دن تک بڑے جشن رہے۔ صنوبر اور فرحت میں بیحد دوستی ہو گئی۔ فرحت نے ڈھیروں ساریاں اسے تحفے میں دیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات میں پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ کیونکہ روپیہ اس کے لیے اب کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ دن رات اس کی موٹریں صنوبر اور قاسم کی خدمت میں حاضر رہتیں۔

"ڈھاکہ لوٹنے سے ایک دن قبل صنوبر چند دوستوں کے ساتھ ایلیفنٹا کی سیر کرنے کے لیے گئی۔ قاسم سرکاری کام کی وجہ سے نہ جا سکا۔ جزیرے پر پہنچتے ہی گروہ کی ایک خاتون کی طبیعت خراب ہو گئی اور دن بھر وہاں رہنے کے بجائے وہ سب دوسری لانچ سے واپس آ گئے۔ صنوبر ایک ٹیکسی لے کر اپالو بندر سے سیدھی فرحت کے یہاں روانہ ہو گئی تاکہ بقیہ وقت وہاں گذارے۔

"جب وہ فلیٹ کے اندر پہنچی تو سارے میں دوپہر کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ راحت کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے جا چکی تھی۔ حسب معمول صنوبر سیدھی فرحت کی شاندار خوابگاہ کی طرف چلی گئی اور ــــ"

"پھر سے دروازہ کھولا" میں نے بات کاٹی۔

"ہاں۔ اور فوراً الٹے پاؤں لوٹی۔ اور لفٹ تک پہنچتے پہنچتے لڑکھڑا کر گرنے لگی تو ایک گھاٹن نے اسے سنبھالا۔ صنوبر نے ہکلاتے ہوئے پوچھا کہ جو صاحب اندر ہے وہ پہلے بھی آ چکا ہے؟

"گھاٹن نے ہونٹ بچکا لیے۔ مگر چونکہ فرحت نے کسی قصور پر اس کی دو ماہ کی پگار ضبط کی تھی اس نے صبح ہی نوکری سے

برطرف کیا تھا لہٰذا اس نے جواب دینے میں نمک حرامی نہ سمجھی اس نے کہا "ہاں بائی۔ صاحب تو ایک چھ سات دن سے روز آتا ہے۔ کبھی دن میں کبھی رات کو۔ آنے کا ٹائم کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ باہر گاؤں سے آیا ہے۔ کل چلا جائے گا۔"

"صنوبر واپس تاج پہنچی اور جب شام کو قاسم نے کمرے میں داخل ہو کر کہا کہ وہ دن بھر کانفرنس میں مغز کھپاتے کھپاتے چُور ہو گیا ہے تو صنوبر نے بڑے سکون کے ساتھ اس کے لیے کافی منگوائی اور اسے سیریڈون کھانے کو دی۔

"کیونکہ اسے واجد کی بات یاد آ گئی تھی کہ وہ اپنی کشتیاں جلا چکی ہے۔

"ڈھاکہ واپس پہنچ کر بھی اس نے کبھی قاسم پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کیا جانتی ہے۔ اور پھر اپنے معمول کے مطابق زندگی گذارنے لگی۔

"اب بی بی اس داستان کا تیسرا باب شروع ہوتا ہے۔"
زرینہ نے شال کو اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر صوفے پر اکڑوں بیٹھتے ہوئے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا "میں لکھنؤ میڈیکل کالج سے ایم۔ بی بی۔ ایس کرنے کے بعد ۱۹۵۲ء میں گائنا کولوجی

میں ایم۔ڈی کرنے ایڈنبرا چلی گئی۔ وہاں سے واپس آکر بلیہ اسم پور ہسپتال میں کام کرنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے میڈیکل کالج میں لیکچرر شپ ملنے والی تھی کہ اسی زمانے میں ڈھاکے سے بڑی آپا کے بڑے پر اسرار سے خط اماں کے پاس آنے شروع ہوئے مجھیں معلوم ہے بھائی جان ۴۷ء سے ڈھاکے میں ہیں۔ وہاں اُن دونوں کی ملاقات ارسلان احمد اور اُن کے گھر والوں سے ہوئی اور بڑی آپا نے ترنت میرے رشتے کی بات چیت شروع کر دی ادھر میں اپنے آئیڈیلز لیے بیٹھی تھی کہ جنتا کی خدمت کروں گی گاؤں میں جا کر کسانوں کا علاج معالجہ کروں گی۔ کچھ عرصہ تک میں نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروجیکٹ کے ساتھ بھی کام کیا اور اب میڈیکل کالج میں گائناکولوجی پڑھانے کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ مگر بڑی آپا کے سامنے کس کی چل سکتی ہے۔ چنانچہ ابا میاں اور اماں نے مجھے زبردستی ڈھاکے چلتا کیا۔ ۵۵ء میں ڈھاکے آئی۔

"ارسلان مجھے بےحد پسند آئے مگر شادی کا فیصلہ فوراً نہ کر سکی۔ تم جانو وہی ٹو بی اور نوٹ ٹو بی TO BE OR NOT TO BE کا جان لیوا مسئلہ۔ بھائی جان میرے ویزا کی میعاد بڑھواتے رہے تاکہ میں اطمینان سے کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

ان ہی دنوں ایک شام بھائی جان اور بڑی آپا کے ساتھ ان کے دوستوں مسٹر اور مسز سیڈرک وارنگٹن کے یہاں "کال" کرنے کے لیے گئی۔ یہ ایک معمّر انگریز جوڑا تھا۔ مسٹر وارنگٹن مشرقی پاکستان کی ایک برطانوی جہاز راں کمپنی کے افسرِاعلیٰ تھے۔ اور بہت جغادری قسم کے انگریز تھے۔ ہم لوگ لان پر جاکر بیٹھے اور ملازم ہماری اطلاع کرنے کے لیے اندر گیا۔ اور چند منٹ بعد کیا دیکھتے ہیں۔ ایک پری جمال لڑکی پتلون میں ملبوس برآمدے سے اتر کر گھاس پر خراماں خراماں چلتی مسکراتی ہوئی ہماری طرف آرہی ہے۔

"جب وہ قریب پہنچی تو مجھے اسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ راحت کاشانی تھی۔ جسے میں نے دس سال قبل کلکتے کے زولوجیکل گارڈن میں دیکھا تھا۔ اب وہ کوئی بتیس تینتیس برس کی رہی ہوگی مگر پہلے سے بھی زیادہ دلکش اور اسمارٹ نظر آرہی تھی۔

"اس نے خالص برطانوی انداز میں بڑے اسٹائل سے بات شروع کی اور کہا کہ سیڈرک اور ہلڈا ابھی باہر گئے ہیں۔ اور وہ ان کی دوست اور ہاؤس گیسٹ ہے اور ہندوستان

سے آئی ہے ۔ اور یہ کہ آپ لوگ کیا بیٹیں گے ۔

"میں نے اسے کلکتے کی ملاقات یاد لائی تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑی اور سجید تپاک اور خلوص سے باتیں کرنے لگی ۔ اور کہا کہ وہ کل ہمارے یہاں آئے گی ۔ میں نے اس سے ممبئی کے پروگریسو گروپ میں شامل دوستوں کی خیر خبر دریافت کی اور راحت کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ بڑے واضح سیاسی شعور کی مالک ہے ۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے بین الاقوامی سیاست اور ادب وغیرہ کے متعلق تبادلہ خیالات کیا ۔ اس کی معلومات کافی وسیع تھیں ۔

"پھر کچھ دیر تک دونوں ملکوں کے درمیان زرمبادلہ کی پابندیوں کا تذکرہ ہوتا رہا ۔ اس نے کہا کہ ہندوستان سے صرف پچاس روپئے لیکر پاکستان آنے کی اجازت ہے ۔" اب ذرا سوچیئے کہ میں صرف پچاس روپئے لیکر یہاں پہنچی ہوں کسقدر کوفت کی بات ہے ۔" تھوڑی دیر میں میزبان بھی آگئے اور راحت جس طرح گھل مل کر ان کے ساتھ باتیں کرتی رہی اس سے ظاہر ہوا کہ گویا وہ ان کے گھر کی ایک فرد ہے ۔

"دوسرے دن وہ ہمارے یہاں آئی اور سجید دلچسپ گفتگو

کرتی رہی: "یہ لڑکی لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا فن جانتی ہے۔"
بڑی آپا نے اظہار خیال کیا۔

"کوئی پندرہ بیس دن بعد ایک روز مس فلیمنگ بڑی آپا سے ملنے آئیں۔ مس کلارا فلیمنگ ہلڈا اور نگٹن کی بوڑھی کنواری بہن تھیں اور انگلستان سے چند ماہ کے لیے آئی ہوئی تھیں۔

"جیسا میں نے تم کو ابھی بتایا وارنگٹن بڑے جغادری قسم کے انگریز تھے۔ اور انگریز اپنے ماں باپ، بہن بھائی کو بھی اپنے گھر پہ مہمان رکھنے کا قائل نہیں۔

"دوسری چیز یہ کہ انگریز ہمیشہ انڈر اسٹیٹمنٹ میں بات کرتا ہے۔ چنانچہ کلارا فلیمنگ نے بر سبیل تذکرہ کہا کہ ڈیر راحت ہمارے یہاں بہت ویلکم ہے۔ اور وہ ایک نہایت ہر دلعزیز لڑکی ہے۔ اسی وجہ سے اس نے یہاں آتے ہی آتے ان گنت دوست بنا لیے ہیں۔ مگر ذرا سی دقت یہ ہے کہ ان دوستوں کے وقت بے وقت ٹیلی فون آتے رہتے ہیں۔ اور ہلڈا اعصاب کی مریض ہے۔

"آپ لوگوں کی راحت سے بہت پرانی اور بے تکلف دوستی ہے اسے سمجھا دیجئے کہ دوستوں کو منع کر دے۔" بڑی آپا نے کہا۔

"ہاں۔ میرا یقیناً یہ خیال ہے کہ تم ٹھیک کہتی ہو۔ سیڈرک اور ہلڈا دو مہینے قبل دہلی گئے تھے۔ وہیں پہلی بار ان کی ملاقات راحت سے ہوئی تھی اور اس پیاری سی بچی نے ان دونوں کی بہت خاطر مدارات کی۔ سیڈرک نے اس سے کہا تھا کہ اگر کبھی وہ ڈھاکہ آئے تو آکر ان کے یہاں ہی ٹھہرے۔ تو وہ سچ مچ آگئی۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کی مہربان آمد ہم لوگوں کے لئے باعث مسرت ہے۔ میری بہن ہلڈا کے اعصاب اس مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے بہت خراب ہو گئے ہیں۔" کلارا فلیمنگ نے آنکھیں چندھیا کر اپنی خلیق مسکراہٹ کا رخ میری طرف کیا۔ "کیا تمہارا یہ خیال نہیں ہے مائی ڈیر کہ بنگال اس موسم میں بہت صبر آزما ہو جاتا ہے؟"

"اس بات کو ایک ہفتہ گذرا ہو گا کہ ایک صبح ہمارے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ راحت بول رہی تھی — میں شاہ باغ میں شفٹ ہو گئی ہوں کسی وقت اِدھر آؤ۔ میں شام تک اپنے کمرے ہی پہ رہوں گی" اور کمرے کا نمبر بتایا۔

"مجھے تعجب ہوا کہ یا اللہ یہ لڑکی پچاس روپے لیکر ہندوستان سے آئی تھی۔ شاہ باغ میں کیسے منتقل ہو گئی۔

"شام کو میں ریس کورس روڈ پر سے گذر رہی تھی۔ تو راحت کے فون کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ اس کے پاس ہوتی چلوں۔ شاہ باغ ہوٹل کی دوسری منزل پر راحت کا شاہی کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا لہٰذا میں دستک دینے کے بعد اندر داخل ہوگئی۔ غسلخانے میں سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ جھل جھل کرتا لباس پلنگ پر رکھا تھا۔ کونے میں میز پر راحت کے دوسرے شوہر غیاث الدّین کی تصویر اور ماڈرن آرٹ کے متعلق مغربی نقادوں کی چند کتابیں رکھی تھیں۔ سنگھار میز پر تازہ پھولوں کا گلدستہ مہک رہا تھا۔ ابھی گلدستے کا سرخ ریشمی فیتہ بھی اس میں موجود تھا۔

"ارے بھئی راحت؟" میں نے آواز دی۔

"غسلخانے کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے اندر سے جواب دیا۔ "ہاں ہاں آجاؤ یہیں آجاؤ۔"

"میں یہ سمجھ کر کہ شاید وہ منہ ہاتھ دھو رہی ہے اطمینان سے اندر چلی گئی۔ اور ہکّا بکّا اور بیحد نادم ہوئی۔

"راحت کسی ہالی ووڈ ایکٹریس کی طرح ٹب میں نیم دراز تھی ٹیلی فون پاس سٹول پر رکھا تھا جس کا ریسیور اس کے ہاتھ

میں تھا۔ میں فوراً الٹے پاؤں واپس جانے کے لئے پلٹی تو اس نے بڑے اطمینان سے کہا آؤ۔ آؤ بیٹھو۔ دوسرے اسٹول کی طرف اشارہ کیا اور ٹیلی فون پر بات کرنے لگی۔

"اب دیکھو بی بی" میری کزن زرتینہ نے ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر کہا: "میں ڈاکٹر ہوں۔ برسہا برس میں نے سینکڑوں ڈیلیوری کیس کیے ہیں۔ طرح طرح کے آپریشن کرنے کی عادی ہوں۔ انسانی اناٹومی میرے لیے کسی نفسیاتی کمپلیکس COMPLEX کی حیثیت نہیں رکھتی۔ تم خود غیر ملکی آرٹ اسکولوں کی لائف کلاس میں کام کر چکی ہو اور جانتی ہو کہ انسانی جسم کے متعلق سارا مسئلہ رویّے کا ہے۔ ڈاکٹروں کا CLINICAL رویّہ، شاعروں، سنگتراشوں اور مصوّروں کا جمالیاتی رویّہ، اور سیدھی سیدھی جنسی اپروچ جس میں صحتمند اور مریضانہ دونوں رویّے شامل ہیں۔ یہ واقعہ کہ راحت نے مجھے غسلخانے میں بلایا اس کی جسمانی نمائش پسندی یعنی EXIBITIONISM کا غمّاز تھا۔ راحت کو اپنے خوبصورت جسم کا شدید احساس تھا۔

"میں اسٹول پر بیٹھ کر راحت سے باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور اس نے بڑی ادا سے پھر ریسور اٹھایا۔

"تب مجھ پر اچانک ایک اور انکشاف ہوا۔ یہ مستقل دن کے خواب دیکھنے والی لڑکی شاید اسوقت یہ تصور کر رہی ہے کہ وہ میری لین منرو ہے اور ہالیووڈ میں اپنے سونے کے ٹب میں (وہاں شاید سونے چاندی ہی کے ٹب ہوتے ہیں نا) لیٹی اپنے عالمگیر شہرت رکھنے والے عشاق یا اپنے پروڈیوسر یا ڈائریکٹر سے گفتگو کر رہی ہے۔ مجھے بیحد رنج ہوا۔ بڑی خجالت محسوس ہوئی۔

"فون ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

" "تم کپڑے پہنو۔ میں باہر بیٹھتی ہوں" میں نے کہا۔ اور باہر آگئی۔ راحت ایک بڑی سی تولیہ لپیٹ کر کمرے میں آئی۔ کپڑے پہنے اور سنگھار میز کے سامنے بیٹھ کر بال سنوارنے لگی۔

" "جب میں اور عنایت ہنی مون کے لیے ساؤتھ اف فرانس گئے تھے وہاں ایک اسٹیشن فوٹوگرافر نے یہ تصویر کھینچی تھی)۔ اس نے پورٹریٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

" "ساؤتھ اف فرانس" عطر کی پھوار اپنی گردن پر ڈالتے ہوئے اُس نے آہ بھری۔ "کسقدر حسین جگہ ہے"۔

"حالانکہ اسوقت میں راحت کے متعلق زیادہ نہیں جانتی تھی مگر نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے

نہ صرف یہ بلکہ وہ طرح طرح کے دل خوش کن جھوٹ، بولنے کی بے حد شوقین اور عادی ہے۔ آخر کیوں؟ ذرا کیپٹن سے میں نے دریافت کیا: "یورپ میں کہاں کہاں گئیں؟"

"دسارے یورپ میں گھومے" اس نے مبہم محتاط اور محفوظ جواب دیا "افوہ۔ میڈی ٹیرینین کی لہریں کسقدر نیلی ہیں۔ میں تو ریویرا کے ساحل پر سنہری دھوپ میں لیٹی لیٹی سمندر کا نظارہ کیا کرتی تھی۔"

"اتنے میں ایک موٹا سا غیر ملکی بغیر دستک دیے کمرے میں آگیا۔ ہر سنگفرڈ فان باخ ۔۔ راحت نے رلوایا جرمن صوفے پر بیٹھ گیا اور پسینہ خشک کرنے کے بعد راحت سے پوچھنے لگا کہ اسے یہ کمرہ پسند آیا؟ اور روم سروس کیسی ہے۔ اب وہ تیار ہے۔ جرمن کے ساتھ نیچے بال روم میں جانے والی تھی۔ میں دونوں کو خدا حافظ کہہ کے باہر آگئی۔

"سالِ نو کی شام کو وہ اسی جرمن کے ساتھ ڈھاکہ کلب میں نظر آئی اور لپک کر میرے پاس پہنچی۔ بڑی آپا نے ذرا سرد مہری کا اظہار کیا۔ آپا کے اس رویے کو اس نے بڑی خوبصورتی سے نظر انداز کر دیا۔ اور ان سے مزید خلوص

کے ساتھ رہلی۔

"ڈھاکہ میں اس نے سب ملنے والوں پر یہ ظاہر کیا تھا کہ میری بہت پرانی اور گہری دوست ہے۔ بڑی آپا اس بات سے بہت سٹ پٹا گئی تھیں۔ راحت نے لوگوں سے یہ بھی کہہ رکھا تھا کہ بڑی آپا اور بھائی جان سے اس کے خاندانی مراسم ہیں۔

"یہ کیا واہیات بات ہے" آپا نے کہا۔ "ارسلان احمد کے گھر والے قدامت پسند لوگ ہیں۔ وہ تمہارے متعلق کیا سوچیں گے کہ تم راحت کا شانی کی دوست ہو"۔

"بیگم آپا۔ ذرا سوچیے تو۔ اس غریب نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ اچھی خاصی معقول لڑکی ہے"۔

"معقول لڑکی ہے۔ معقول" آپا نے بڑے الم سے کہا۔

"لیکن میں جانتی تھی کہ راحت اپنے آپ کو بے حد غیر محفوظ محسوس کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح خود کو ایسے لوگوں سے متماثل کرے جن کے قدم زندگی میں مضبوطی سے جمے ہیں۔

"منتو ہماری پڑوسن تھی مگر راحت اس سے کبھی نہیں

ملی ۔ابھی راحت شاہ باغ ہوٹل ہی میں قیام پذیر تھی کہ ایک شام صنوبر گھبرائی ہوئی آپا کے پاس آئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ارے ہے۔ خیر تو ہے۔ کچھ منہ سے تو بول بچی" آپا نے گھبرا کر کہا۔

"تم جانتی ہو آپا ان پتی ورتا عورتوں میں سے ہیں جنکا خیال ہے کہ اگر شوہر شرابی۔ بدمعاش یا جرائم پیشہ بھی ہو تب بھی بیوی کو مرتے دم تک اس کے ساتھ نباہ کرنا چاہیئے۔ آپا ڈولا آئے اور جنازہ نکلے والے مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتی ہیں (اور صد افسوس کہ یہ مدرسہ فکر اب تیزی سے معدوم ہوتا جارہا ہے) چنانچہ وہ اصولی طور پر صنوبر کی اس حرکت کو ناپسند کرتی تھیں کہ وہ اپنا شوہر اتنا بچہ چھوڑ کر دوسرے آدمی کے گھر آ گئی ہے۔ مگر بہر حال، صنوبر ایک بڑی خاموش، شریف طبیعت کی ملوسی لڑکی تھی اسلیئے آپا کو اس سے انس بھی بہت تھا۔

"صنوبر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "وہ پڑیل — وہ — وہ ڈائن — وہ بلّے بھی آن پہنچی ہے۔

"کون بھئی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"۔۔فرحت — اور کون — قاسم ایک ہفتے سے گھر سے غائب ہے۔ مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ دورے پر شمالی بنگال جا رہا ہے اور ابھی ابھی واجد نے آکر بتایا کہ جے ڈیپ پور کے راستے میں لانچ پر جشن ہو رہے ہیں"

"مجھے دفعتاً یاد آیا۔ ان ہی آپی راستوں اور ان ہی جہازوں پر صنوبر قاسم سے چوری چھپے ملا کرتی تھی اور شمشاد غم و غصے اور بے بسی کے عالم میں پیچ و تاب کھاتا رہتا تھا۔

"آپا نے آہستہ سے کہا، بٹیا، جس مرد کے ہاتھ میں تمہارے باپ نے تمہارا ہاتھ دیا اسے تو تم بلا قصور ٹھکرا کر چلی آئیں۔ کیا قاسم سے بیاہ کرتے وقت تم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دراصل کس قسم کا انسان ہے؟ خود کردہ را علاج نیست بی بی۔ اب صبر کرو،"

"آپا —" میں نے کوفت کے ساتھ کہا۔ صنوبر اور زیادہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"مجھے تو تمہاری یہ صنوبر کچھ بیوقوف سے دکھتی ہے،" آپا نے رنجیدہ آواز میں اظہارِ خیال کیا۔

"اسی وقت برآمدے میں قدموں کی چھاپ سنائی دی۔

دیکھا کہ واجد سامنے کھڑا ہے۔

"یہ کیا باؤلا پن ہے۔ چلو گھر چل کر منھ ہاتھ دھوؤ۔ بچیاں تم کو یاد کر رہی ہیں" اس نے کہا۔

"صنوبر نے ذبح ہوتی ہوئی بھیڑ کی طرح نظریں اٹھا کر واجد کو دیکھا۔ واجد نے بڑی دلسوزی اور دردمندی کے ساتھ سہارا دیکر اسے کرسی سے اٹھایا اور بچوں کی طرح سنبھالتا اور دلاسے دیتا اسے ہمالیے احاطے سے باہر لے گیا۔

"آپا نے مغرب کی نماز کے لیے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے گہرا سانس بھر کر کہا اللہ۔ تیری دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں"

"ایک مہینہ گذر گیا۔ ایک شام میں باہر گھاس پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ صنوبر نے مہندی کی باڑ پر سے ایک کر مجھے دیکھا اور پھر چاروں طرف نظر ڈال کر دوڑتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ اس کا چہرہ سپید ہو رہا تھا۔ قریب کی کرسی پر وہ اس طرح بیٹھی جیسے بہت بوڑھے۔ خستہ جان، تھکے ہارے لوگ بیٹھتے ہیں۔

"زرینہ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "بتاؤ میں اب کیا کروں"

"قاسم صاحب واپس آ گئے"؟

"ہاں۔ مگر وہ کہتے ہیں کہ محبت۔ مر چکی ہے۔ محبت مر چکی ہے۔ سنا تم نے زرینہ"؟ اس نے جھک کر گھاس کی چند پتیاں اکھیڑیں پھر انھیں بکھیر دیا۔ "محبت جسے ابدی، اور زندہ جاوید کہا جاتا ہے۔ شیلانگ میں۔" اس نے مشرق کے گلرنگ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس نے کیا کیا کچھ مجھ سے کہا تھا۔ کیسے کیسے وعدے کیے تھے۔ اور اب۔ اب، اُن سارے لطیف احساسات کا، سارے خوابوں کا، اس ازلی اور ابدی محبت کا جنازہ نکل گیا۔ زرینہ۔"

"میں خاموش رہی۔ میں اس سے کیا کہہ سکتی تھی۔ درختوں میں ایک پپیہا زور زور سے بول رہا تھا۔ آم کے جھنڈ میں کوئل کوک رہی تھی۔ ارے پپیہا باورے آدھی رات جن کوک۔ دھیرے دھیرے سلگتی سو وہ تو نے دینی پھونک۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اور میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"دفعتاً، سفید غرارے قمیص میں ملبوس، سفید دوپٹے

سے سر ڈھانپے آپا کی جھلک نیم تاریک برآمدے میں نظر آئی۔ انھوں نے آواز دی "صنوبر۔ دونوں وقت مل رہے ہیں، سر ڈھکو اور اللہ سے دعا مانگو" وہ اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ گھیری شام کا سناٹا ڈراؤنا ہو گیا۔

"زرینہ۔" صنوبر مدھم لیکن مضبوط آواز میں کہہ رہی تھی۔ تمہارا خیال ہے مجھے مرجانا چاہیئے۔ کیونکہ میں محبت کی تھی؟"

"بکواس مت کرو" میں نے غیر یقینی لہجے میں جواب دیا۔

"زرینہ۔ وہ کہتا ہے کہ فرحت اس کے لئے مکمل عورت ہے۔ برسوں پہلے۔ کلکتے میں وہ اس کی مکمل عورت کی حیثیت سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اور اب جب وہ اسے دوبارہ مل گئی ہے تو وہ اسے پہلے کی مانند ترک نہیں کر سکتا"

"پھر اس نے تمہارا گھر برباد کر کے تم سے شادی کیوں کی تھی؟ تم نے یہ نہیں پوچھا"

"وہ کہتا ہے کہ وہ وقت کی بات تھی" وہ تلخی سے ہنسی "وقت کی بات! زرینہ اسوقت میں دوسرے کے کھیت کی گائے۔ نہیں۔ گھاس۔ تھی۔ جو ہمیشہ دوار سے زیادہ

ہری نظر آتی ہے۔" وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

"مگر فرحت یہاں آئی کس طرح ہے؟"

"اس کا میاں سرُوپ کمار اپنی نئی لیڈنگ لیڈی سے عشق کرنے میں مصروف ہے۔ اور دونوں میاں بیوی کو ایکدوسرے کی زیادہ پرواہ نہیں رہی۔ مگر یہ عورت بیحد سمجھدار ہے۔ اس نے وہ سارا روپیہ جو اسے سرُوپ کمار نے دیا تھا "بیک ڈور" سے یہاں منتقل کروالیا ہے۔ اور ——اور—— اللہ—— یہ سب کسقدر خوفناک گھٹیا باتیں ہیں۔ دنیا اتنی گھٹیا کیوں ہے زرینہ؟"

"اس سوال کا جواب تو بڑے بڑے فلسفی اور پیغمبر بھی نہیں دے سکے،" میں نے فوراً اکتا کر جواب دیا۔ "قاسم کو رتی بھر احساس نہیں کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے۔ زرینہ۔ انسانی جسم کی موت ایک بیالوجیکل ایکشن ہے۔ کیا محبت کی موت بھی ایک بیالوجیکل ایکشن ہے؟"

"ہاں—— انسان میں بیالوجیکل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی طرح جذبات بھی بدل جاتے ہیں۔"

"اب فرحت اور قاسم بالکل اجنبی ہیں۔ اور دو بالغ ہیں۔"

بتاؤ میں کیا کروں۔؟

"اگر واقعی ایسا ہے تو تم کچھ نہیں کر سکتیں صنوبر تم ایک مرد اور ایک عورت کے مابین ان کے خالص ذاتی، جذباتی معاملات میں دخل انداز نہیں ہو سکتیں"۔

"ایک مرد — ایک مرد —؟" اس نے انتہائی کرب سے دہرایا۔ "وہ میرا شوہر ہے زرینہ"

"آسمان پر بادل اُمنڈ کر گھر آئے، بارش آنے والی ہے صنوبر اب گھر جاؤ" میں نے کہا۔

"میرا گھر — کہاں ہے؟"

"آخر قاسم صاحب تم سے کہتے کیا ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ وہ بات ہی نہیں کرتے۔ آج انھوں نے صرف اتنا کہا کہ اب ہم دونوں کا اکٹھا رہنا ہم دونوں کی ایکدوسرے کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ میں — میں کل ارمنی ٹولہ میں ایک بزرگ کے یہاں بھی گئی تھی" اس نے نیچی آواز میں کہا "انھوں نے ایک نقش دیا ہے"

میں آنکھیں پھاڑ کر صنوبر کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے براؤن بال جھٹک کر اور نیلی آنکھیں جھپکا کر مجھے ملتجیانہ، پرامید

نظروں سے دیکھا۔ بتاؤ۔ اس کا کوئی فائدہ ہوگا؟ مگر آج دوپہر وہ پڑھ یا واجد کے ہاتھ لگ گئی۔ انھوں نے اُسے پھاڑ کر پھینکدیا اور مجھے خوب ڈانٹا۔ مگر میں شاہ صاحب سے دوسرا نقش لاسکتی ہوں۔"

"بادل گرجنے لگے۔ پپیہے کی پی کہاں، تیز ہوگئی۔ صنوبر! میں نے مضبوطی سے کہا "گھر جاؤ"۔

"یہ عورت — یہ عورت۔ کیا اسے بمبئی میں عشاق کی کمی تھی۔ یہ میرا گھر برباد کرنے کیوں آگئی۔؟ اللہ کے یہاں کوئی انصاف نہیں۔ انصاف کے کیا معنی جب کوئی وجود ہی نہیں ہے تمہارے ان خداوند تعالےٰ کا" وہ بلک بلک کر رونے لگی اور اٹھ کر بھاگتی ہوئی بنی کوٹھی کی طرف چلی گئی۔

"صبح کو آپا کی ملازمہ نے بتایا کہ برابر والی بیگم صاحب کہیں باہر جارہی ہیں۔ واجد صاحب کی کار پر سامان لدرہا ہے۔

"کوئی گیارہ بجے کے قریب واجد نے مجھے فون کیا وہ ایرپورٹ سے بول رہا تھا۔ اس نے کہا صنوبر کا نروس بریک ڈاؤن ہورہا ہے۔ میں اُسے تبدیل آب وہوا کے لیے اپنے ساتھ کسولی لے جارہا ہوں۔ قاسم کل رات ایک ماہ

کے لیے پھر دورے پر چلا گیا ہے۔ اگر وہ واپس آکر تم سے صنوبر کے متعلق دریافت کرے تو اسے بتا دینا کہ صنوبر اب میری ذمّے داری ہے۔ خدا حافظ۔"

"لیکن قاسم سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی۔ اسی رات لکھنؤ سے تار آیا کہ ابّا میاں سخت بیمار ہیں۔ میں اور آپا بدحواس ہو کر تیسرے دن لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ ایک ڈیڑھ مہینے میں ابّا میاں اچھے ہوئے تو ڈھاکے سے ارسلان کی والدہ نے تقریباً روزانہ ٹرنک کال شروع کر دیے کہ کم از کم منگنی کی رسم باقاعدہ ادا ہو جانی اشد ضروری ہے۔ اُن کو ڈر تھا کہ میں شاید رسّی تڑا کر بھاگ نکلی ہوں اور اب لکھنؤ سے ڈھاکے واپس جانے پر تیار نہ ہوں۔ سچّی بات یہ ہے کہ ابّا میاں کی بیماری اور صنوبر وغیرہ کی انتہائی کنفیوزڈ اور بے تکی زندگیوں کا مرقع دیکھنے کے بعد بھیّا میں نے ٹھر ٹھرا کر ہاں کر دی (اور اللہ کا شکر ہے کہ اپنے اس فیصلے سے بے حد، بے حد خوش ہوں۔)

"چنانچہ میں آپا کے ساتھ ڈھاکے لوٹ آئی۔ ارسلان احمد کے ساتھ باضابطہ منگنی کی رسم ادا ہوئی اور شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

"ارسلان احمد کی سب سے بڑی بہن جہاں آرا آپا کے میاں ٹھوی، اسٹیمر کمپنی میں ملازم ہیں۔ انھوں نے مجھے آپا اور بھائی جان کو اپنے یہاں فینچو گنج مدعو کیا۔ میرے سسرال والے بڑے سیدھے سادے اور نیک طینت لوگ ہیں اور بیحد خوش باش۔ پروگرام یہ تھا کہ جہاں آرا آپا کے یہاں تین چار روز تک "ہاوس پارٹی" منائی جائے گی۔ وہاں ارسلان کی ساری بہنیں بہنوئی بھائی اور بھاوجیں جمع ہونے والے تھے۔ اور بھیا میرا تو نروسنس کے مارے برا حال۔ مگر خیر۔

"تو ہم سب تمہاری پسندیدہ جگہ فینچو گنج پہنچے۔ واقعی بڑا افسانوی ماحول تھا دور دور تک بکھرے ہوئے لکڑی کے بنگلے۔ دریا کے کنارے بنے ہوئے پگوڈا ایسے مکان اور بقول تمہارے سخت چینی اور برمی قسم کی فضائیں۔

"صبح کو سارا قبیلہ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا اور بڑا غل مچ رہا تھا کہ جہاں آرا آپا کی لاڈلی ٹین ایج لڑکی شمس آرا بھاگتی ہوئی اندر آئی اور بولی — امی — پندرہ نمبر میں انڈیا سے "مرزا غالب" کے ریکارڈ آئے ہیں چلیے جلدی سے چل کر ان کو ٹیپ کر لیں۔ چلیے۔ اٹھیے" اور ...ٹھنک کر ان کی سرخ کنارے

والی سفید ساری کا آنچل گھسٹنے لگی۔

"اے ہے بچّی،" جہاں آرا آپا نے اس سے کہا، "تمہاری نئی ممانی دلہن تمہارے لیے ہندوستان سے ڈھیروں ریکارڈ لے آئیں گی ایسی گھبراہٹ کیا ہے؟"

"میں شرم سے سرخ ہو گئی اور ہڑبڑا کے دولہا بھائی یعنی جہاں آرا آپا کے شوہر سے دریافت کیا، پندرہ نمبر میں کون رہتا ہے؟"

"قاسم علوی،" انھوں نے مختصر جواب دیا۔ میں چپکی ہو رہی

"نہیں۔ ہم تو ثریا کے گانے ابھی ٹیپ کریں گے۔ قاسم صاحب کل شاید چلے جائیں،" شمس آرا نے ضد جاری رکھی۔

"چنانچہ دولہا بھائی نے قاسم کو ٹیلی فون کیا کہ رات کے کھانے کے ہم سب اُن کے یہاں دھاوا بولیں گے۔

"بی بی۔ وہ رات بڑی عجیب سی تھی۔ نجانے کیوں میرا دل دھڑک رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں صنوبر کے ساتھ غدّاری کر رہی ہوں۔ ارسلان مجھ سے بار بار پوچھتے کہ تم خاموش کیوں ہو۔ مگر میں کوئی جواب نہ دیتی۔ کھانے کے بعد ٹیپ ریکارڈر سنبھال کر شمس آرا سب سے پہلے اسٹیشن ویگن

یں جا بیٹھی، اور سارا کنبہ جیپ اور اسٹیشن ویگن یں لد کر "پندرہ نمبر" پہنچا۔

"بیحد طویل و عریض جگمگاتی لکڑی کے بنگلے پر خاموشی طاری تھی۔ ہم لوگ برآمدے اور گیلری عبور کر کے اندر گئے جہاں ایک بے انتہا وسیع ڈرائنگ روم کے آتشدان میں آگ جل رہی تھی۔

"چند منٹ بعد قاسم اور فرحت مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ میں چونک اٹھی۔ بالکل اسی انداز سے قاسم صنوبر کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالے مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوتا تھا۔

"فرحت مجھے دیکھ کر بڑے تپاک سے میرے پاس آئی میں ڈھاکے میں اس سے کئی بار راحت کے ساتھ مل چکی تھی۔

"راحت کہاں ہیں آج کل؟" میں نے کھوکھلی آواز میں سوال کیا۔

"بمبئی گئی ہے۔ لیکن اس کی شادی ہونے والی ہے۔"

"اچھا۔ ہر سنگفرڈ ... ن بارخ سے ؟"

"ارے نہیں۔ ... یونیٹ کینیڈین ہے۔ چارلس فریزر

وہ راحت کو بہت دن سے کورٹ کر رہا تھا مگر وہ نہیں مانتی تھی کیونکہ وطن چھوڑ کر سات سمندر پار جا بسنا کیا تک ہے، پھر اس نے مہمانوں کی خاطر مدارات شروع کی۔ وسیع اونچی چھت والا کمرہ باتوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ پھر شمس آرا نے ثریا کے تازہ ترین ریکارڈ جو فرحت بمبئی سے لائی تھی، ریڈیو گرام پر لگائے اور ان کو ٹیپ کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد میرے پیارے بنگالی سسرال والوں نے بنگالی گیت گائے۔ غرضیکہ بڑی تفریح رہی بقول شخصے

"چلتے وقت دولہا بھائی نے فرحت سے کہا، شب بخیر، بیگم قاسم!"

"اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں مسز سروپ کمار ہوں! تشریف آوری کا دلی شکریہ،" اور مسکرا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

"ہماری بڑی آپا اور بھائی جان کی طرح دولہا بھائی بھی پرانی اقدار کے آدمی ہیں۔ بے چارے کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا اور جھینپ کر نظریں نیچے کیے کیے آگے بڑھ گئے۔

"بی بی جس وقت ہم سب اس وسیع گہرے کمرے

ہیں بیٹھے تھے اور ثریا کی آواز ع کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے، کی تکرار کر رہی تھی تب دفعتاً ایسا ہوا آواز کے باوجود سناٹا چھا گیا۔ اور ایسا لگا جیسے وجود کی ساری رمٹ پشیمانی اور لغویت اور خستگی اور بے معنی پن اور بے رحمی دریا پر بکھرے کہرے کے ریلے ساتھ کمرے میں گھس آئی ہے۔ اور ایسا لگا جیسے — جیسے وقت سُن رہا ہے — میں — میں وضاحت نہیں کر سکتی کہ میں کیا کہنا چاہتی ہوں مگر تم سمجھ گئیں نا ؟"

دور جنگلوں میں گولیاں چلنے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر زرینہ کو دیکھا" سرحد یہاں سے بہت قریب ہے"۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر سر جھکاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ اور پھر کہانی شروع کر دی۔

" شادی کے بعد میں اور ارسلان ایک شام ڈھاکہ کلب میں بیٹھے تھے۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ کیلنگ کی قوم سے ترکے میں حاصل کیا ہوا یہ انیسویں صدی کا برطانوی اپر کلاس انسٹیٹیوشن برِ صغیر کے بڑے شہروں میں پرانی اسنوب ویلیو رکھنے کے علاوہ نئے دولتمند طبقے کی ایسی چوپال بن چکا ہے

جہاں سیاست، ہائی فنانس اور دل کے سودے کس دھڑلے سے ہوتے ہیں۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ راحت ایرفورس کے افسروں کے جمگھٹے میں کھڑی چہک رہی ہے۔ مگر وہ بارہ تیرہ برس قبل والی راحت تھی جسے میں نے کلکتے میں دیکھا تھا۔

"مس عصمت کاشانی" کوئی کہہ رہا تھا۔

"عصمت بی بی بے چادری" کسی اور نے زیر لب کہا۔

"میں نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ ایک ونگ کمانڈر نے تعارف کروایا۔ عصمت کاشانی۔ ابھی کوئٹے سے بی۔اے کر کے آئی ہیں۔ راحت اور فرحت کی چھوٹی بہن۔ عصمت نے بڑی تمکنت و غرور سے سلام کیا۔ اس میں راحت اور فرحت جیسی ملنساری اور اخلاق نہیں تھا۔ اسے ان صفات کی شاید ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ بے پناہ حسن کی مالک تھی۔ جو زندگی میں اس کی کامیابی کا ضامن تھا۔ میں نے ایک لحظے کے لیے پھر ان عجیب و غریب بہنوں کے پر اسرار پس منظر کا تصور کیا۔ خانہ بدوشوں کے کارواں۔ سرد چشمے، سیب اور بادام کے جھنڈ۔"

"اسی وقت فرحت بھی آکر اس گروہ میں شامل ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں اور ارسلان وہاں سے کھسک آئے۔

"ارسلان کا تبادلہ سلہٹ کا ہو گیا۔ اور یہاں جانتی ہو ہماری ملاقات جب ہم اس بنگلے میں آئے، تو سب سے پہلے کس سے ہوئی؟"

"مسٹر اور مسز واجد۔!

"اُن کے یہاں ایک لڑکا بھی ہے۔ صنوبر کی ممی حسب معمول شیلانگ سے چند مہینے کے لیے بیٹی داماد کے پاس آجاتی ہیں۔ صنوبر اور واجد کبھی بھولے سے بھی اپنے اپنے ماضی کا ذکر نہیں کرتے۔ تم کو شاید یاد ہو کہ واجد وہ شخص ہے، جو کلکتے میں راحت کا شانی کا اور ریجنل اور غالباً پہلا عاشق تھا۔ جب وہ وار پبلیسٹی کے محکمے میں کام کر رہی تھی اور اس کے ساتھ رہتی تھی۔ مگر واجد نے اس سے شادی نہیں کی تھی۔ اس نے کہا تھا 'میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس کی عزت نہیں کرتا'۔ یاد ہے نا؟"

"ہاں۔"

"اور میں سمجھتی ہوں" زرّینہ نے گلا صاف کر کے کہا "کہ یہ دونوں، یعنی صنوبر اور واجد، اپنی زندگی سے میرا مطلب ہے کہ کافی مطمئن ہیں۔

"کوئی چار مہینے کی بات ہے، میں ڈھاکہ گئی ہوئی تھی۔ وہاں اب ریسٹوران اور نائٹ کلب کھل گئے ہیں۔ اور ڈھاکہ وہ پہلا سا خوابیدہ، پُر فسوں شہر نہیں رہا۔ بہرحال، تو وہاں ایک دوکان سے نکل رہی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں کہ قصبہ ریسٹوراں کے سامنے ایک چمکدار تھنڈر برڈ کھڑی ہے جس کا ہُڈ اترا ہوا ہے۔ اور پچھلی سیٹ پر فرحت اور عصمت کاشانی اذابزادیوں کے سے انداز میں بڑے ٹھسّے سے بیٹھوا ہیں۔ قصبہ کا ویٹر چاء کی کشتی پیش کر رہا ہے۔ اور چند حضرات کار سے لگے ہوئے کھڑے دونوں حسینائز سے باتوں میں مصروف ہیں۔

"جگہ کی تنگی کی وجہ سے مجھے اُن کی کار سے بالکل سٹ کر نکلنا پڑا تو فرحت نے خاصی بے اعتنائی سے کہا ——

"ہلو زرینہ!"

"ہلو — ہلو —، میں نے ٹھٹھک کر اس کی خیریت دریافت

کی اور پوچھا کہ قاسم صاحب کیسے ہیں۔ (کیونکہ میں نے سنا تھا کہ قاسم نے صنوبر کو طلاق دینے کے بعد فرحت سے ، جو سروپ کمار سے طلاق لے چکی ہے ، باقاعدہ شادی کر لی ہے) اس پر فرحت نے انتہائی سرد مہری سے جواب دیا ـــــ

"مجھے معلوم نہیں"

"یقین جانو میں بیحد قائل ہوئی۔ اور اپنی بیوقوفی کا کامل یقین ہو گیا۔ جب میں تیزی سے سڑک عبور کر کے اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی تو قصبہ میں سے نکلنے والے دو نوجوانوں کے دو فقرے میرے کان میں پڑے :۔

'سونا کھودنے والیاں' اور 'پبلک سیکٹر!'

"اور تب دفعتاً مجھ پر انکشاف ہوا۔ تمہارا اور میرا محبوب، خوابیدہ، مرنجان مرنج، سیدھا سادا، غریب، شریف، بھولا بھالا، پروِنشل ڈھاکہ اب ایک ماڈرن، صنعتی، سوفسٹی کیٹیڈ SOPHISTICATED بڑا شہر بن چکا ہے اور اس حیرت انگیز قلب ماہیت کی ایک علامت یہ چمکیلی تھنڈر برڈ بھی ہے جو قصبہ ریسٹوران کے سامنے کھڑی ہے ـــــ لیکن ــ" اس نے توقف کے بعد کہا "ملک کی

اس خوش آیند ترقی کے ساتھ یہ شاخسانے ناگزیر ہیں ہمیں اس چمکدار ٹھنڈر ربرڈ کو بھی غالباً قبول کرنا ہوگا "۔

شہرزاد کی پرچھائیں ساکت ہوگئی۔ رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ آتشدان کے شعلے مدّھم پڑ گئے۔ کمرے میں اب صرف دیوار پر لگا ہوا الکٹرک کلاک روشن تھا۔ میں نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ کلاک کا روشن چہرہ جو صرف وقت بتاتا رہتا ہے۔ بیرحمی، بے تعلقی، بے نیازی کے ساتھ۔ اس کو ذرّہ بھر پرواہ نہیں کہ سارے وقت تم پر کیا بیت رہی ہے۔

" چنانچہ بی بی " میں نے کچھ دیر بعد کہا " یہ تمہارے ہاں کی زندگی ہے "

" ہاں۔ مگر ایک قسم کی زندگی اور بھی ہے — " شہرزاد کی پرچھائیں نے کہا۔

" جس کو میں اس سرزمین پر سارے میں کھوجتی پھرتی ہوں۔ وہ چاروں طرف بکھری نظر آجاتی ہے۔ جس کو میں لکھے ہوئے الفاظ اور سلولائیڈ کی ریل کی گرفت میں لانا چاہتی ہوں۔ مگر وہ زندگی اتنی زخمی، اتنی گمبھیر، اتنی وسیع و عظیم

ہے ۔"

"۔ کہ اس کی عکاسی اور ترجمانی کے لیے دل وجگر کا خون کرنا ہوگا۔" شہرزاد کی پرچھائیں نے میری بات کاٹی۔

"۔ پھر بھی کامیابی مشکل ہے ۔ یہ میرا قلم ۔" میں نے اسٹاپرٹے پر رکھے ہوئے فاؤنٹن پن کو تاسف سے دیکھا۔ "کتنا کمزور اور ناکافی اور بے معنی اور مجبور ہے ۔"

اچانک سامنے کے برآمدے میں بندھے ہوئے السیشن نے زور زور سے بھونکنا شروع کر دیا۔

"ٹھہرو ۔ میں دیکھتی ہوں ۔" میں نے قریب کے فلور لیمپ کا سوئچ دبایا ۔ شہرزاد کی پرچھائیں غائب ہوگئی ۔ زرینہ کمرے کی لمبائی عبور کر کے دریچے میں گئی ۔ میں نے اس کے پیچھے پیچھے جا کر دریچے کا پردہ سرکایا اور باہر جھانکا جھلملاتے عنابی فرش والے چوڑے برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے کتا بے تحاشا چلا رہا تھا۔

سامنے پھیکی چاندنی میں دو سائے گھاس پر سے گذرتے آہستہ آہستہ بنگلے کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ ایک لمحے کے لیے میں اور زرینہ سہم کر رہ گئے ۔ ارسلان بھائی

آنکھیں ملتے اپنے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آئے
اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلے۔ پرچھائیاں
سیڑھیوں پر آکر سرنگوں بیٹھ گیئں۔

ارسلان بھائی نے ڈپٹ کر کتّے کو چپ کرایا۔ سیڑھی پر
خون کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ زرینہ نے مجھے آواز دی۔
"میرا بیگ۔ جلدی۔ میرے کمرے کی کھڑکی میں" میں نے
برآمدے کی روشنی جلائی اور سائے ایک مرد اور ایک عورت
میں تبدیل ہو گئے۔ بھورے رنگ کی شکستہ لوئی میں لپٹا
ہوا نوجوان تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ لڑکی جس نے گھونگھٹ
میں چہرہ چھپا رکھا تھا ارسلان بھائی کو دیکھ کر پام کے
گملے کے پیچھے دبک گئی۔ ارسلان بھائی نے جھک کر اجنبی نوجوان
کو غور سے دیکھا اور دفعتاً سوال کیا۔ "کچھار سے آئے ہو؟"

وہ خاموش رہا۔ اور دہشت زدہ نظروں سے ارسلان بھائی
کو دیکھنے لگا۔ پھر اس نے بیحد سہم کر ہاتھ جوڑ دیے۔ میں نے
زرینہ کا میڈیکل بیگ لا دیا۔ بنگلے کا چوکیدار کھٹ کھٹ
ڈنڈا بجاتا باغ کے اندھیرے میں سے نمودار ہوا۔ زرینہ
نے نوجوان کی ٹانگ کا معائنہ کیا۔ "شکر ہے گولی نہیں لگی۔

یہ چوٹ کسی اور وجہ سے آئی ہے۔" زرینہ نے کہا پھر اس نے لڑکی کو مخاطب کیا۔" لو اپنے آدمی کو ادھر لٹا دو۔" شاگرد پیشے کی طرف سے دو تین ملازم دوڑتے ہوئے آن پہنچے۔ لڑکی نے گھبرا کر چہرہ اچھی طرح چھپا لیا۔" اگر تم اس طرح منھ چھپائے رکھو گی تو کیسے کام چلے گا۔ لو ادھر سے اس کی ٹانگ پکڑ لو۔ ذرا شاباش۔"

زرینہ مرہم پٹی میں مصروف ہو گئی۔ لڑکی نے ڈرتے ڈرتے پہلی بار بات کی" ای نج جہئین بیگم صاحب۔؟"

زرینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔" پاربتی۔!!!"

پاربتی نے آگے کھسک کر زرینہ کے پاؤں پکڑنا چاہے۔

" گڈ گاڈ۔ وی آر اِن فار ٹربل۔" زرینہ نے پیچھے ہٹ کر انجکشن کی سرنج بھرتے ہوئے کہا۔

ارسلان بھائی نے سگریٹ سلگایا۔ اور ڈریسنگ گاؤن پہنے پہنے، سیڑھیاں پھلانگ کر جیپ میں جا بیٹھے۔" زرینہ یہ بارڈر ان ہی ڈنٹ ہے۔ احتیاط سے کام لو۔ میں تحقیقات کے لیے جاتا ہوں۔" دوسرے لمحے جیپ ٹیلے کی ڈھلوان اتر کر اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چند منٹ بعد احاطے کا دوسرا

پھاٹک ہیڈ لیمپوں کی روشنی سے جگمگا اٹھا۔ پولس جیپ زناٹے سے آکر رکی۔ سب انسپکٹر نے اتر کر زرینہ کو سیلوٹ کیا۔ اور غیر قانونی طور پر ملک میں داخل ہونے والے بھارتی مسلمان مسمی غفور الرحمٰن میاں کو حوالہ پولیس کرنے کا مطالبہ کیا۔

"صاحب ابھی بارڈر پر گئے ہیں۔ اُن کے آنے کا انتظار کیجئے۔" زرینہ نے جواب دیا۔

اجنبی نیم بیہوشی کے عالم میں بڑبڑایا۔ سپاہی اور کانسٹبل جیپ سے اتر کر ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔

سب انسپکٹر نے آگے بڑھ کر دوسرا سوال کیا۔ "بیگم صاحبہ۔ رام پرشاد ہیڈ چوکیدار کی لڑکی یہاں آئی ہے؟ یہ اغوا کا کیس بھی ہے بیگم صاحبہ۔"

پاربتی نے لرز کر زرینہ کی ساری کا پلّو پکڑ لیا اور اس کے پیچھے چھپ گئی۔

"تھانیدار صاحب" زرینہ نے بھویں اٹھا کر پوچھا۔ "اگر یہ شخص اس ملک کا باشندہ نہیں ہے تو آپ اس پر اغوا کا مقدمہ کس طرح چلائیں گے؟"

"خدا کے لیے زرینہ۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم اپنا قانون مت چھانٹو۔ تم کو کیا معلوم قانونی پوزیشن کیا ہے؟"

"بکواس۔" زرینہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "بہرحال۔" اس نے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ "صاحب کا انتظار کیجئے۔" اب پو پھٹنے والی تھی۔ سپاہی برآمدے کے نیچے بجلی کی روشنی میں ارسلان بھائی کی واپسی کے منتظر رہے اور زرینہ کے ملازموں سے باتیں کرنے لگے۔ سب انسپکٹر نے ٹہلتے ہوئے دُور جا کر سگریٹ جلایا۔ اور سگریٹ ختم کرنے کے بعد واپس آکر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ ایک ملازم نے گرم چائے لا کر زخمی کو پلائی۔ جو نیم بیہوشی کی حالت میں بڑبڑایا کیا۔ پاربتی اس کے قدموں کے نزدیک سر جھکائے بیٹھی رہی۔ زرینہ نے اس سے سارا واقعہ پوچھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بالکل خاموش تھی۔

سورج نکلتے نکلتے ارسلان بھائی واپس آئے۔

سب انسپکٹر نے ان سے آہستہ آہستہ مفصل بات کی۔ ارسلان بھائی سر نیہوڑائے، تیوری پر بل ڈالے غور سے

سنتے رہے۔ پھر زخمی کو جیپ پر بٹھایا گیا۔ چلتے وقت اس نے زرتینہ کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہتا ہو۔ الساں دوست خاتون! آخر تم نے بھی میرے ساتھ دغا کی نا۔ دوسری جیپ پر پارتبی کو زبردستی چڑھایا گیا تو وہ پچھاڑیں کھانے لگی۔ اس نے مڑ کر زرتینہ کو دیکھا بھی نہیں۔ دونوں گاڑیاں پھاٹک سے باہر نکل گئیں۔

اب بنگلے کے عقب میں زرتینہ کی ہری بھری وسیع سبزی باڑی میں مرغ نے اذان دی۔ ہم لوگ ڈرائینگ روم میں واپس آئے، بیرے نے جھلملاتی ہوئی چاندی کی کشتی میں سجے کوئین آین ٹی سٹ اور اسپوڈ چائنا میں چاے لاکر سامنے رکھی۔ سویرا ہو گیا۔ سامنے دریا کے پانی میں دھلے اجالے نے چاے کے باغ آہستہ آہستہ روشن کر دیے۔

صبح دس بجے سری منگل سے اکرم خاں کیمرہ مین کا فون آیا کہ وہ کراچی سے آگیا ہے اور ٹی گارڈن کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔

اس کے آنے کے بعد میں اور زرتینہ اسے ساتھ لیکر

نزدیک کی مختصر سی ایر فیلڈ پر گئے جہاں مختصر سا طیارہ منتظر کھڑا تھا۔ خوش اخلاق پنجابی پائلٹ نے مسکرا کر خوش آمدید کہا۔ طیارہ اوپر اٹھا۔

بڑا شگفتہ، سہانا دن تھا۔ تیز نیلے آسمان پر رنگ برنگے پرندے ہوا کی لہروں میں تیر رہے تھے۔ حد نظر تک سبزہ پھیلا تھا۔ نیلے پانیوں میں گھرے ناریل، سپاری اور تاڑ کے درختوں کے جزیروں پر سفید بگلے اور چیلے منڈلا رہے تھے۔ جگہ جگہ ہرے بھرے گاؤں کے جھونپڑوں پر زرد، سرخ اور کاسنی پھولوں کے بیلیں لہلہا رہی تھیں۔ جھیلوں میں سرخ کنول کھلے تھے۔ نالوں میں نیلوفر اور سوسن جگمگاتے تھے۔ ندیوں میں نو کے چل رہے تھے۔ آخر ہم کاہے کی لوکیشن تلاش کر رہے ہیں؟

اکرم خاں وقتاً فوقتاً جھک کر کیمرہ چلا دیتا۔ پیچیدہ پہاڑی راستے کے کنارے ایک وائرلیس والی جیپ کھڑی تھی۔ کچھ فاصلے پر چند فوجی ٹہل رہے تھے۔ "کل رات یہاں ایک معمولی ان سی ڈنٹ ہوا تھا" پائلٹ نے بشاشت سے مطلع کیا۔

اب ہم دریا کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ نیچے پانی کی جگمگاتی سطح پر بھیرب بازار پاکستان سے اگر تلہ ہندستان کی سمت مسافروں سے لدے ہوئے اسٹیمر رواں تھے۔ اگر تلہ سے بھیرب بازار کی سمت مسافروں سے لدے ہوئے اسٹیمر آ رہے تھے۔

"آسام اور ایسٹ پاکستان کے درمیان معاملہ بہت گڑبڑ ہے۔" پائیلٹ نے اظہار خیال کیا۔ "اتنا قانونی ٹریفک بھی خطرناک اور غیر قانونی تو ـــــ" اس نے بات پوری ختم کیے بغیر جنوبی سلہٹ کا رخ کیا۔

"پنچو گنج ـــــ!" میں نے کہا۔ زرینہ اور میں نیچے جھانکنے لگے۔ جہاں سرخ چھتوں والے پگوڈا ایسے گھروں کے قطار دریا کے کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھی۔ اکرم خاں نے ذرا تعجب سے پوچھا: "آخر کیا رکھا ہے ان بیک روڈ جگہوں میں؟"

سلہٹ شہر کے اونچے پل پر ٹریفک کا جم غفیر چیونٹیوں کی طرح گذر رہا تھا۔ شاہ جلالؒ کی سفید درگاہ پر عقیدتمندوں کی نشست و آمد و رفت جاری تھی۔ صحن میں کبوتروں کے جھنڈ بیٹھے تھے۔ ٹین کے مکانوں کے سامنے چٹائیاں اور بید کا فرنیچر بنایا

ا رہا تھا۔ بازار میں سڑک کے کنارے سنترے کے ڈھیر لگے تھے۔ تیسرے پہر کو ہم لوگ گھر واپس پہنچے۔ کل ہم گھنے جنگلوں کے اوپر ہیلی کوپٹر میں جائیں گے۔

دوسری صبح ہم نے ہیلی کوپٹر کے ذریعے ایک بے انتہا خوش منظر کھاسی گاؤں تلاش کر لیا۔ افق پر کامروپ کی اونچی پہاڑیاں تھیں۔ گاؤں کے دوسری جانب چاء بگان کے ٹیلے حد نظر تک پھیلے تھے۔ تیسری طرف گھنا جنگل تھا جس کے درمیان سے سرحد کی غیر مرئی لکیر گذرتی تھی۔ چاء بگان کے سب سے اونچے ٹیلے کی چوٹی پر کسی اسکاٹش پلانٹر کا اکیلا بنگلہ دور سے نظر آرہا تھا۔

"یہاں مسٹر اور مسز اینگس ڈنکن چالیس سال سے رہ رہے ہیں۔" زرینہ نے مجھے بتایا۔" ذرا سوچو تو چالیس سال۔ انسان کہاں پیدا ہوتا ہے اور کہاں کہاں جا کر اپنی زندگی گذار دیتا ہے۔ گلاسگو سے آکر اینگس اور نورا ڈنکن نے اپنا ماہ عسل اسی بنگلے میں منایا تھا۔ یہیں ان کے تین لڑکے پیدا ہوئے جو جوان ہو کر پچھلی لڑائی میں مارے گئے۔

اب دونوں میاں بیوی پھر تنہا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب روزانہ شام کو اپنے برآمدے کے سامنے ندی میں ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ یہ ان کی زندگی کی بھی بڑی پرسکون اور خوبصورت شام ہے۔"

دوسرے روز اندھیرا پڑے میں اکرم خاں کے ساتھ شوٹنگ کے متعلق انتظامات کرنے کے لیے رام نندن مکھیا کے گاؤں گئی تو دیکھا کہ تقریباً ساری بستی چوپال میں جمع ہے۔ فیکٹری اور باغوں سے لوٹتے ہوئے مزدور آ آکر برگد کے نیچے اکٹھے ہو رہے تھے۔

"شاید بنیادی جمہوریت کی پنچایت ہو رہی ہے۔ ویلیج لیول پر ——" اکرم خاں نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ چند ماہ قبل میں نے بنیادی جمہوریتوں کے متعلق ڈوکومنٹری فلم کا مسالہ جمع کرنے کے لیے صوبے کے وسطی اضلاع کے دیہات کا دورہ کیا تھا۔ مگر پوربی مزدوروں کا یہ مجمع بنگالی گاؤں کی پنچایت سے مختلف معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے چوپال کے قریب جاکر رام نندن کو آواز دی۔ وہ سر پہ انگوچھا لپیٹتا دوڑا آیا۔

"کوئی تہوار ہے رام نندن؟" میں نے دریافت کیا۔
"آج برادری پاربتی کا پھیسلہ کر رہیے۔" اس نے متانت سے جواب دیا۔ اکرم خاں "چھرے" تلاش کرنے بستی کے اندر چلا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پاربتی سر جھکائے آم کے نیچے بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کرید رہی تھی۔ اس کا باپ رام پرشاد دوسرے درخت کے نیچے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی ماں ایک جھونپڑے کی دیوار سے لگی بین کر کر کے بیٹی کو کوسنے میں مصروف تھی۔ پاربتی کے بازوؤں پر نیل پڑے تھے۔ پاربتی تو ایسٹ بین کلبہ کی اس عنائی ڈوکومنٹری کا ایک اہم کردار بننے والی تھی با

دوسری صبح میں کھاسی گاؤں کی طرف جا رہی تھی کہ جنگل کے راستے پر غفور الرحمٰن میاں نظر آ گیا۔ وہ سڑک کے کنارے لوئی اوڑھے اکڑوں بیٹھا تھا۔ پھر وہ بڑی مشکل سے آلتی پالتی مار کے بیٹھا اور زخمی ٹانگ پھیلا کر زرینہ کی باندھی ہوئی پٹی جو میلی اور ڈھیلی پڑ چکی تھی بڑے دھیان سے دوبارہ کسنے لگا۔ جب اپنے نزدیک رکتی دیکھ کر وہ اس رات کی طرح سہما نہیں بلکہ بڑے استہزا سے مجھے

مجھے گھورنے لگا۔ اتنے میں کچھ فاصلے پر ایک باشاہت میں سے بارڈر پولیس کا ایک سپاہی نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ دس بارہ آدمیوں کا گروہ تھا جو ایک کنبہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں بوڑھے، بوڑھیاں، بچے اور نوجوان سبھی شامل تھے۔ وہ سب سرحد کے پھاٹک کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ غفورالرحمٰن میاں ان سب سے پیچھے لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ اور اس کے عقب میں ایک اور سپاہی تھا۔

جیپ آگے بڑھی۔ راستے کے دونوں طرف سفید تیتریاں اڑ رہی تھیں۔ جنگل کے اندر سرنگ جیسے گھرے، تنہا راستے پر سے اکا دکا گھاسی عورت گذر جاتی تھی۔ آسمان پر ایک ڈیکوٹا گوہاٹی کی سمت سے آیا اور گڑگڑاتا ہوا کلیشر کی طرف نکل گیا۔ کیا یہ طیارہ بھی فضا میں دخل اندازی کر رہا ہے؟ انسان ایسی سرزمینوں پر دخل اندازی کر رہے ہیں جن کے لیے ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی حق نہیں۔ انسان ایک دوسرے کے جذبات میں، دلوں میں دخل اندازی کر رہے ہیں۔ سرحدوں کے متعلق، کون کس کا فیصلہ کرے گا؟

"اُس رات والے معاملے کا عقدہ ابتک حل نہیں ہوا" رات کو مسٹر اور مسز میلکم مک فرسن کے یہاں کھانے کی میز پر زیبنیّر نے کہا۔

"غفورالرحمٰن میاں" ارسلان بھائی نے چاول کی قاب سنتھیا مک فرسن کے ہاتھ سے لیتے ہوئے جواب دیا۔ اُن لاکھوں لوگوں میں سے ہے جو روزی کی تلاش میں پردیس چلے جاتے ہیں۔ کلکتے میں ریور نیوی گیشن کا بیشتر عملہ سلہٹ کے ملاحوں پر مشتمل ہے جن کی قومیت اب بھی پاکستانی ہے۔ غفورالرحمٰن میاں بھی سلہٹی ملاح ہے۔ اور اپنے اسٹیمر پر آسام سے یہاں آتا رہتا تھا۔ ہمارے اسٹیمر گھاٹ پر اسے پاربتی مل گئی جو ہماری فیکٹری سے برآمد ہونے والی چائے کی پیٹیاں ڈھو کر اسٹیمروں پر چڑھاتی ہے۔"

" پاربتی کا باپ میری اسٹیٹ پر بھی چوکیداری کر چکا ہے۔" میلکم مک فرسن نے سر اٹھا کر مجھے بتایا۔

" پاربتی اور غفورالرحمٰن میاں" ارسلان بھائی نے رائی کی شیشی اپنی جگہ پر واپس رکھتے ہوئے کہا" ایک دوسرے کو بے انتہا چاہنے لگے۔ رواج کے مطابق پاربتی کی بچپن

سے کسی شخص سے سگائی ہو ئی چکی ہے جو چاندپور بگان پر کام
کرتا ہے اور اس کے باپ سے دس سال بڑا ہے۔ بہت جلد
اس کا گونا بھی ہونے والا تھا۔ پاربتی نے غفور سے کہا کہ وہ
اسے اپنے ساتھ آسام یا کلکتے بھگا لے جائے۔ مگر غفورالرحمٰن
میاں نے اس سے کہا کہ وہ اور اس کے ماں باپ اپنے آبائی
گاؤں واپس آنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ اس کے ماں
باپ اور دوسرے گھر والوں کو پاکستانی کی حیثیت سے مشکلات
کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے پاربتی کو اپنے آنے کی اطلاع
کرا دی اور یہ لڑکی راتوں رات اسے لینے کے لیے بارڈر پر پہنچی۔
ان کا ارادہ تھا کہ جنگلوں جنگلوں ہوتے دریا پر پہنچ کر جنوبی
سلہٹ چلے جائیں گے جہاں غفورالرحمٰن میاں کا آبائی گاؤں
ہے۔ لیکن بارڈر پر دل آسام سے آنیوالوں اور سمگلروں
کی روک تھام کے لیے بیحد چوکس ہو چکا ہے۔ غفورالرحمٰن میاں
کے ساتھ ہی ایک اور قافلہ سرحد کے جنگل میں داخل ہوا تھا۔
تبھی پولس کے سپاہیوں نے چند سمگلروں کے تعاقب میں
گولی چلا دی۔ پاربتی اور غفور سرپٹ بھاگے۔ مگر ناکہ بندی کو
توڑ کر نکلنا ناممکن تھا۔ بھاگتے میں غفور گھپ اندھیرے میں

کافی بلندی سے کھڈ میں جا گرا۔

"مگر ذرا اس لڑکی کی بہادری اور عقل دیکھئے" ارسلان بھائی نے میلکم تک فرسن کو مخاطب کیا" اسے معلوم تھا کہ گیارہ بجے ہماری فیکٹری کا ٹرک خلاں راستے سے گذرتا ہے۔ وہ غفور کو گھسیٹتی ہوئی سڑک کے موڑ تک لے گئی اور جب ٹرک قریب آیا تو ڈرائیور سے التجا کی وہ ان دونوں کو میرے یہاں پہنچا دے۔ اسوقت تک غفورالرحمٰن بیہوش ہو چکا تھا یار بتی یہ بھی جانتی تھی کہ غفور کو لیکر یہاں آنا بیحد خطرناک ہے — لیکن اسے ہماری زرینہ بیگم پر بڑا ناز تھا۔"

زرینہ نے فوراً ٹپ ٹپ رونا شروع کر دیا۔

" ارے ارے عجیب بیوقوف لڑکی ہو —" ارسلان بھائی گھبرا گئے۔

کھانے کے بعد آگ کے سامنے بیٹھتے ہوئے میں نے ارسلان بھائی سے کہا" ایک بات بتائیے۔ ان گنت انسان سرحد کے دونوں طرف ڈھکیلے جا رہے ہیں۔ اور باہر کی دنیا میں اس قیامت خیز المیے پر دھیان دینے کی کسی کو فرصت

نہیں۔ کسی کو احساس نہیں کہ ان ہزار ہا بے خانماں، بھوکے، اسٹیٹ لیس انسانوں پر کیا گذر رہی ہے۔ جن کو پاکستانی کی حیثیت سے آسام سے اس طرف روانہ کر دیا جاتا ہے اور جب وہ یہاں آتے ہیں تو ان کو بھارتی کہہ کر پھر واپس دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس المناک صورتِ حال کے ذمے دار وہ خود تو نہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟"

"حکومتوں کے لئے بین الاقوامی قوانین کی پابندی بھی تو کوئی شے ہے۔ تم غالباً تراج کی خواہاں ہو۔ حکومتیں —" میلکم مک فرسن نے کہنا شروع کیا۔ "حکومتیں حکومتیں —!" میں نے چڑ کر ان کی بات کاٹی۔

"اب ہم ساری دنیا کی بگڑی تو نہیں بنا سکتے۔" میلکم مک فرسن نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "مصیبت یہ ہے" انھوں نے اپنا پائیپ سلگاتے ہوئے اضافہ کیا" کہ تم ضرورت سے زیادہ حسّاس ہو۔"

"یہ شخص، غفور الرحمٰن میاں، یہ بھو کا ننگا فاقہ کش ملّاح، اور اس کے فاقہ کش ماں باپ۔ اور بہن بھائی غالباً صرف اتنا جانتے ہیں کہ ملکوں کے بیچ میں دیواریں کھڑی ہیں مگر دکھ کی

کوئی سرحد نہیں ہے۔ وہ غالباً نہیں جانتے کہ ان گھنے جنگلوں میں آسام کہاں ختم ہوتا ہے اور سلہٹ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ یا یہ کہ اقوام متحدہ میں برلن کی سرحد کے سلسلے میں، ان کی نمائندگی پاکستان کو کرنی چاہیئے یا ہندوستانی ڈیلی گیشن ان کی ترجمانی کرے گا۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ ان کا بانس کا جھونپڑا اور انناس اور دھان کا کھیت سرما ندی کے کنارے تھا جہاں پرکھوں کے زمانے سے وہ رہتے آئے تھے۔ اور اب وہ ان کا نہیں — پھر غفور الرحمٰن میاں اسمگلنگ کی طرف بھی راغب ہو جاتا ہے۔"

میلکم مک فرسن نے مجھے ذرا دھیان سے دیکھا "تم غالباً ٹھیک کہہ رہی ہو۔" انھوں نے پائپ کا کش لگا کر کہا" مگر اس صورت حال کا کیا علاج ہے؟"

"آئیے۔ ماہ جونگ کھیلا جائے!" سنیتھیا مک فرسن نے شگفتگی سے تجویز کیا۔

کراچی سے میرے تار کا جواب ابتک نہیں آیا تھا۔ دو تین دن بعد میں نے طے کیا کہ شوٹنگ شروع کر دینی مناسب ہے۔

صبح سویرے ببیجا نے ساریوں کے بنڈل نکالے۔ دس دس روپئے کی رنگ برنگی ساریاں، پگڑیاں اور دھوتیاں، اور چاندی کے گہنے جو میں "اداکاروں" کو تحفے کے طور پر دینے کے لیے ڈھاکے سے خرید کر لائی تھی۔ زرینہ نے خود کو گویا کوسٹیوم ڈپارٹمنٹ کا انچارج مقرر کیا۔ اکرم خاں مع چپڑاسی کے اپنا ساز و سامان لے کر سری منگل سے سیدھا لوکیشن پر پہنچنے والا تھا۔ میں اور زرینہ اپنے لوازمات کے ساتھ جیپ میں سوار ہونے والے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجی مسٹر ہربرٹ کننگھم کے فوری آپریشن میں میری مدد کے لیے جلد از جلد ہسپتال پہنچیے" ٹی اسٹیٹ کا میڈیکل افیسر گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"او مائی گاڈ۔" زرینہ نے مایوسی سے رسیور رکھا۔

"کیا ہوا۔ خیریت ؟"

"ہربرٹ کننگھم ایک نوجوان پلانٹر ہے شاید اپنڈی سائٹس کا آپریشن ہے۔ تمہاری شوٹنگ مس کرنی پڑے گی۔ خدا حافظ۔" وہ جلدی سے اپنی کار میں بیٹھی اور ہسپتال کی طرف اڑنچھو ہو گئی۔

"سیلٹ" پر بڑی گہما گہمی تھی۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ بے شمار دبلے پتلے فاقہ زدہ بچے چاروں طرف کھڑے حیرت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ ارسلان بھائی کے چائے باغان کے مزدور مرد اور عورتیں جن کو خاص طور پر آج کے دن کے لیے چھٹی دی گئی تھی ڈھول مجیرے سنبھالے کیمرے کے گرد گھیرے کھڑے تھے۔ اور اپنی نئی دھوتیوں اور ساریوں کے بنڈل دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

پھر لڑکیاں ساریاں اور گہنے پہن کر شرماتی ہوئی ایک طرف کو آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"پاربتی کہاں ہے؟" میں نے رام نندن سے دریافت کیا۔ وہ چپ رہا۔

"پاربتی کہاں ہے رام نندن؟"

"بیٹا۔ وہ پیچھے چھپی بیٹھی ہے۔۔۔ برادری کی اجّت کا معاملہ ہے بیٹیا۔۔۔" اس نے رکتے ہوئے کہا۔

میں نے پاربتی کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ وہ ایک جھونپڑے کے پچھواڑے تالاب کے پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ میں نے کپڑوں کا بنڈل اسے دیا۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"پاربتی۔ دیکھو۔ کتنی سندر سباری ہے۔ لال لال ایکدم
ہیرا بلاؤز۔ اور یہ دیکھو گہنے۔ کرن پھول اور طوق۔ یہ آلتا
کی شیشی ہے۔ تم کپڑے پہن کر آؤ۔ پھر تمہارا سنگھار کرینگے۔"
اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا بھی نہیں۔
"پاربتی۔ سب باہر ولایت کا لوگ تمہرا سینیما دیکھیں
۔ لیبو۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مجھے
فکر ہو گئی۔ وقت نکلا جا رہا تھا۔ اچانک رام نندن ڈنڈا
لیے اس کے سر پر آن کھڑا ہوا۔ "جو بٹیا کہت ہیں کرت
کاہے نا ہیں ہے۔ پھر مار کھیہئے۔" اس نے گرج کر کہا۔
جواب میں میں نے رام نندن کو ڈانٹنا چاہا۔ مگر اتنے
میں پاربتی سرعت سے اٹھی اور بنڈل اٹھا کر ایک جھونپڑے
میں گھس گئی جو "گرین روم" کا کام دے رہا تھا۔
جب وہ تیار ہو کر "سیٹ" پر آئی تو اکرم خاں حیرت
سے اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ "کیا غضب کا کیمرہ فیس ہے"
اس نے کیمرے میں جھانک کر کہا۔ اور چہرے کا فاصلہ
ناپنے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے ایک بیل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اسکرپٹ نکالا جو چیا وبگان کے ریلوے اسٹیشن پہنچ کر لکھتے لکھتے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

....

۱۰۔ مزدور کام کر رہے ہیں۔
۱۱۔ مزدوروں کا لوک ناچ۔
شگفتہ چہرے۔

دھرتی کے جیالے بیٹے اور بیٹیاں دھرتی کے مدھر، حیات بخش گیت گاتے ہوئے۔

ہاہاہا۔ میں نے کاغذ زمین پر رکھ دیا اور دوربین اٹھا کر سامنے دیکھنے لگی۔ اکرم خان کو چاہیئے کہ پینا شوٹ ساؤنڈ کے جھنڈ سے شروع کرے۔ میں نے دوربین کا رخ جنگل کی سمت کیا۔ دور بل کھاتے راستے پر سے ایک سبز رنگ کی جیپ گذر رہی تھی۔ اور مسز رنیا فریزد اسے چلا رہی تھیں۔ وہ تنہا تھیں۔

سیکوئینس ۲ گھنا جنگل۔
(ماحول تعمیر کرو)
ایک جیپ گذر رہی ہے۔

چاروں طرف اندھیرے گھنے جنگلوں میں خوبصورت باگھ بگھیلے اور ہرن اور دور دور سے آئے ہوئے سیلانی

.. اور شکاری ہی ————

میں نے فوراً دوربین گھاس پر رکھ کر رام نندن کو آواز دی۔
جو نئے کپڑے پہنے ڈھول گلے میں لٹکائے خوش خوش پھر رہا تھا۔
" رام نندن ــــ" میں نے دوبارہ پکارا۔
" بٹیا ــــ" وہ دوڑا ہوا آیا۔
" دیکھو ہماری جیپ لیکر سیدھے جاؤ اور میم صاحب
کی ہری جیپ کا پیچھا کرو۔ اور ان کو روک کر ہمارا اسلام
بولو۔ جلدی۔ ایکدم "
" جی بٹیا ــــ" رام نندن ترنت ڈرائیور سے بات کر کے
مسز فریزر کے تعاقب میں ہوا ہو گیا۔
آدھ گھنٹہ گذر گیا۔ لیکن رام نندن یا مسز فریزر کا
پتہ نہ تھا۔ وقت نکلا جا رہا تھا۔ میں اکرم خاں کی جیپ
میں بیٹھ کر جنگل کی طرف روانہ ہوئی۔
لیکن گھنے درختوں سے گھری سڑک سنسان پڑی تھی۔
خودرو اودے پھولوں پر سفید تتریاں اڑ رہی تھیں۔
جھاڑیاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اور پرندوں کی
چہکار سے گونج رہی تھیں۔ مسز فریزر کا کہیں نام و نشان

نہ تھا۔ میں نے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ کر ڈرائیور سے جیپ روکنے کو کہا اور نیچے اتر کر دوربین کے ذریعے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ راستے کے آگے سے مکمّل خاموشی شروع ہوتی تھی۔ اس بلوریں خاموشی میں، زرد پتّوں پر چلتی ہوئی میں وادی کے سنّاٹے میں داخل ہوگئی۔ نیچے سڑک پر دو کھاسی نوجوان سائیکلوں پر جا رہے تھے۔ اور سفید گھاس ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اچانک میری نظر نشیب کی سمت گئی جہاں بانس کے جھنڈ میں سبز جیپ کھڑی تھی۔ اور مسنر فریزر کیمرہ سنبھالے سفید پھولوں سے لدی ہوئی ایک "روبی ٹری" کے تنے سے لگی کھڑی تھیں۔ انھوں نے سرخ رنگ کی بیحد چست پتلون پہن رکھی تھی۔

اتنے میں ایک سیاہ رنگ کی فورڈ کونسل دوسری طرف سے آئی اور واحد چارد کی جھاڑیوں کے نزدیک اترا۔ شاید وہ معائنہ کرنے آیا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ میں کاغذات تھے اور تیوری پر بل پڑے تھے۔ وہ ایک سنجیدہ شکل والا، ذرا جھکا ہوا، طویل القامت، آدمی تھا۔

وہ باغ کے سپروائزر سے بات کرنے میں مصروف رہا۔ پھر چند چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے سروں پہ ہاتھ پھیرا جو بانس کے ڈبوں میں چائے کے بیج کے پیڑے جمع کر رہے تھے۔ اسکے بعد وہ دوسرے باغ کی طرف بڑھا۔ یہاں اس نے ڈھلوان کے پاس کار روک لی اور کاغذات نکالے۔

اچانک اس کی نظر مسز فریزر پر پڑی جو درخت کے نیچے بت بنی کھڑی اسے آتا دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھٹھک گیا۔ راحت نے نظر پھیر کر اسے دیکھا اور درخت کے تنے سے سر لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔ واجد چند قدم آگے بڑھا۔ پھر ٹھٹھک گیا۔ اور چند سکنڈ تک چپ چاپ کھڑا راحت کو دیکھتا رہا۔ پھر یکلخت پلٹا۔ اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا، کندھے جھکائے، کار میں جا بیٹھا، اور زنّاٹے سے پہاڑی کے نیچے اتر گیا۔

راحت نے آنکھوں پر ہتھیلیاں پھیریں۔ رومال نکالکر چہرہ پونچھا۔ بال پیچھے کو جھٹکائے۔ گہرا سانس لے کر تن کر کھڑی ہو گئی۔ شانے سیدھے کیے۔ اور آہستہ آہستہ چلتی، جیپ میں جا بیٹھی۔ اسی وقت رام نندن کی جیپ

اس کے قریب جا پہنچی۔ میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی اور لوکیشن پر واپس آگئی۔

میرے واپس پہنچنے کے چند منٹ بعد مسز فریزر بھی آگئیں انھوں نے مسکرا کر دور سے ہاتھ ہلایا اور جیپ میں سے کود کر "سیٹ" پر آگئیں۔

"ہائی ــــ" انھوں نے کہا۔

"گڈ مارننگ مسز فریزر" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مسز فریزر کیا آپ اس منظر میں حصّہ لینا پسند کریں گی؟" میں نے ان کو منظر سمجھایا۔

"شیور ــــ آئی وڈ لو ٹو ــ!"

"تو آئیے تھوڑی سی ریہرسل کر لیں۔"

"شیور ــــ"

میں نے کیمرے کے پیچھے جا کر ان کو دیکھا۔ واقعی ان میں غضب کا "اسٹیج سنس" تھا۔ وہ بڑی ادا سے جیپ سے اتریں۔ مسکرائیں۔ مزدوروں کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا۔ گاؤں کی لڑکیوں نے ان کو پھول پیش کیے۔ لوک ناچ کے دوران میں بیحد ایکسائیٹ منٹ کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے

تالیاں بجائیں۔ مکمل امریکن ٹورسٹ۔

وہ مجھ سے اور اکرم خاں سے مستقل انگریزی میں گفتگو کرتی رہیں۔ اور مزدوروں سے بہت ٹوٹی پھوٹی امریکن اردو میں ایک آدھ بات کی۔ اکرم خاں نے شوٹنگ شروع کردی۔

مسز فریزر کی پیشانی پر داہنی طرف پٹی کا کراس بنا ہوا تھا جسے انھوں نے بڑے سلیقے سے بالوں کی سنہری لٹ میں چھپا لیا تھا۔ اکرم خاں نے ان کے اور "اسٹار ڈانسر" پارتی کے باری باری کئی کلوز اپ لیے۔

اچانک سورج پر بادل آ گئے۔ اکرم خاں نے کندھے اچکا کر ہاتھ پھیلائے اور آسمان کو دیکھا مسز فریزر ہنسنے لگیں۔ پھر وہ ادا سے سر نیہوڑا کر اس طرح چلتی ہوئی جیسے پانی پر رواں ہوں، میرے پاس آئیں اور بولیں۔ "جی۔ از نٹ اِٹ اکسائیٹنگ۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مُووی کیمرے کا سامنا کیا ہے۔ از نٹ اِٹ فن ـــ"

"میں بہت خوش ہوں کہ آپ کو یہ اچھا لگا مسز فریزر" میں نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔

"ابھی میرا کام باقی ہے؟"

"جی ہاں - تھوڑا سا - اگر آپ کو زحمت نہ ہو - آپ اسیطرح جیپ میں بیٹھ کر جنگل کے راستے سے گذریے - میں نے چپراسی کو ابھی اپنے گھر بھیجا ہے کہ میرے بہنوئی کی بندوق لے آئے"!

"بندوق ___؟" انھوں نے آنکھیں پھیلا کر مصنوعی طور پر خوفزدہ ہوتے ہوئے پوچھا -

"جی ہاں" آپ کا ایک شاٹ بندوق کے ساتھ بھی بہت عمدہ رہے گا - باقی "شکاریوں" کو ہم کل پرسوں جمع کر لیں گے"

"تو اب میں شکار پر جاؤں، گی؟ لیکن ابھی تو میں لوک ناچ دیکھ رہی تھی - یہ کیسے ہو گا؟" مسز فریزر نے غضب کے بھولپن سے پوچھا -

"میڈیم وہ سب ایڈٹنگ کے وقت دیکھا جائے گا - ابھی آپ مہربانی سے ذرا جیپ اسٹارٹ کر دیجئے"! اکرم خاں نے جو ایک اکل کھرا پٹھان تھا - ذرا جھنجھلا کر جواب دیا - بادل ہٹ گئے تھے -

"شیور"

اکرم خاں نے کیمرہ چلا دیا - مگر چند منٹ بعد گھرے بادلوں

نے دوبارہ سورج کو ڈھانپ لیا۔

"لنچ بریک" اکرم خاں نے آواز دی۔

زرینہ کا ملازم جیپ میں سے کھانے کی ٹوکریاں نکال کر لایا۔ "آئیے مسز فریزر" میں نے کہا۔

"جی نہیں شکریہ۔ میں صبح بہت کافی ناشتہ کر کے چلی تھی۔ اور میں دوپہر کا کھانا کبھی نہیں کھاتی۔ میں اتنی دیر میں چند ضروری خط لکھ لوں۔ جب میری ضرورت ہو مجھے فوراً بلا لیجئے گا۔" مسز فریزر نے کہا اور تھوڑی دور جا کر ایک خالی جھونپڑے کے برآمدے میں بیٹھ گئیں اور بیگ سے کاغذ نکال کر لکھنے میں منہمک ہو گئیں۔

تیسرا پہر آگیا۔ سائے طویل ہو گئے۔ دن ڈھلنے لگا مگر آسمان صاف نہیں ہوا۔ مسز فریزر جھونپڑے کے برآمدے میں لگاتار سگریٹ پی کر لکھنے اور ایک کتاب پڑھنے میں مصروف رہیں۔

"آخر کب تک انتظار کیا جائے؟" اکرم خاں نے عاجز آکر کہا۔

"جب تک بادل نہ چھٹیں، اکرم خاں" میں نے جواب دیا۔

"کبھی تو سورج نکلے گا۔"

"اور اگر بالکل نہ نکلا تو؟ آج کا دن بالکل بیکار گیا۔"

"جب تک وقت ہمارے ہاتھ میں ہے ہم بادل چھٹنے کا انتظار کریں گے۔" میں نے مضبوطی سے جواب دیا۔ وہ ٹہلتا ہوا گاؤں کی طرف چلا گیا۔

جاڑے کی شام بہت سرعت سے وادی پر چھانے لگی۔ چپڑاسی بندوق لے کر ابھی نہیں آیا تھا کہ پیک اپ کا وقت آ گیا۔ اتنے میں مسٹر میلکم مک فرسن کی کار زنائے سے آ کر سیٹ کے سامنے رکی اور مسٹر مک فرسن بھاگتے ہوئے، بیحد سراسیمہ میری طرف آئے۔

"مسز فریزر یہاں ہیں؟ ان کو اجازت دو کہ میرے ساتھ فوراً چلی چلیں۔" بھاری بھر کم اور متین مسٹر مک فرسن کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

مسز فریزر جنھوں نے سارا دن جھونپڑے میں بیٹھے بیٹھے گذار دیا تھا مسٹر مک فرسن کی آواز سن کر ہماری طرف آئیں۔

"ریٹا۔ فوراً میرے ساتھ چلو۔"

"کیا ہوا — خیریت؟"

میلکم یک فرسن نے جواب دیے بغیر مسز فریزر کو گھسیٹ کر کار میں ڈھکیل دیا۔ اور اپنی جگہ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے سر نکال کر مجھے آواز دی "میں رات کو تمہارے یہاں آؤں گا۔" دوسرے لمحے کار درختوں میں غائب ہو گئی۔

"اداکاروں" کی ٹولیاں اپنے اپنے جھونپڑوں کی طرف روانہ ہو گئیں۔ شرمائی لجائی لڑکیاں منھ میں پلو ٹھونس کر یا کھلکھلا کے ہنستی ہوئی ٹولیاں بنا بنا کر ادھر ادھر بکھر گئیں۔ انھوں نے اپنی پھٹی پرانی ساریاں دوبارہ پہن کر اپنی نئی ساریاں کل کی شوٹنگ کے لیے سینت لی تھیں۔ پاربتی ایک درخت کے نیچے بیٹھی اسی طرح چپ چاپ اپنے گہنے اتار رہی تھی۔ اور بار بار بے چین، وحشت زدہ نگاہیں اٹھا کر دور جنگل کے راستے کو دیکھ لیتی تھی جس پر اب کہرہ منڈلا رہا تھا۔

پھر اس نے اپنی نئی ساری اور گہنوں کی پوٹلی بنا کر بغل میں دابی اور پیر کے انگوٹھے سے کنکروں کو ٹھوکریں مارتی مارتی اپنے گاؤں کی طرف چل دی۔

جس وقت ہماری جیپ گاؤں کی ڈھلوان سے اتر رہی تھی رام نندن دوڑا دوڑا آیا۔ "بٹیا۔ بٹیا۔ اپنے کاغج بھول گئیں ۔۔۔۔ یہ لیجئے ۔"

میں نے رام نندن کے ہاتھ سے ڈوکومنٹری کا فائل لیا۔ اس کے ساتھ ہی چند اور کاغذات تھے۔ میں ان کو ترتیب دینے لگی۔ تو ایک اجنبی تحریر دکھلائی پڑی۔ میں نے ذرا تعجب سے اس پر سرسری نظر ڈالی۔

سلہٹ

۲۳ر دسمبر ۱۹۶۰ء

میرے پیارے اباجی تسلیم ۔

راشدہ پھوپھی کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ میں نے اندور کے ہسپتال میں اسپیشل وارڈ کا انتظام کروا دیا ہے ۔ آپ کے آپریشن کے لیے۔ فوراً وہاں داخل ہو جائیے۔ میرا دل آپ کو دیکھنے کے لیے تڑپتا ہے اور میں بیحد پریشان ہوں۔ اور جلد آپ کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ اللہ تعالےٰ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ ہمیشہ قائم

رکھے۔ آمین۔ میں یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔
تاکہ شام کی گاڑی سے نکل جائے۔ امی جان کو میرا
دست بستہ آداب کہئیے گا۔ سکینہ اور رابعہ ڈھاکے
میں خیریت سے ہیں۔

آپ کی تابعدار بیٹی محمودہ،

تحریر پر چند آنسو بھی ٹپکے تھے کیونکہ سیاہی ایک آدھ جگہ
سے بہہ گئی تھی۔ ساتھ ہی لفافہ تھا:۔

'جناب مولوی عبدالصمد صاحب
مکان ۱۹ متصل مدرسہ عالیہ اسلامیہ
عثمان گنج۔ ضلع سیہور۔
سابق بھوپال اسٹیٹ
مدھیہ پردیش۔ انڈیا

"یہ کہاں سے ملا۔ رام نندن جی" میں نے پوچھا۔
"بٹیا او سارے سے یہ ڈھیر سارے پتّے بٹور کر لایا ہوں"
اس نے جواب دیا۔

جیپ آگے بڑھی۔ وادی میں پہنچتے پہنچتے کہرے کے
ایک ریلے نے آلیا اور بلوچستان کی برف پوش پہاڑی خانقاہ،

خانہ بدوشوں کے سردار۔ کے زرّین خیمے اور الغوزے کی موسیقی اس کہرے میں ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی۔

مجھے بیحد ندامت ہوئی کہ میں۔ نے انجانے میں کسی کا خط کیوں پڑھ لیا۔ لیکن ۔ مجھ ۔ بنت عبدالصمد ۔ تم کو اس پیہم خود فریبی، اس فرار مسلسل سے کیا حاصل ہوا؟ کچھ تو بتاؤ۔ کچھ تو کہو۔

میں نے خط لفافے میں رکھ کر ڈرائیور سے کہا کہ کرنل مورگن کے بنگلے کی طرف سے ہوتا چلے۔ اور اندر جا کر خط فریزر میم صاحب کو دیدے۔ جو وہ جلدی میں گاؤں کے جھونپڑے میں چھوڑ آئی تھیں۔

لیکن کرنل مورگن کا بنگلہ خاموش پڑا تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ سب لوگ ریلوے اسٹیشن گئے ہیں۔

میں نے گھر کے راستے میں شوٹنگ کے متعلق فائل سمیٹا لیکن ایک ڈوپ شیٹ کے نیچے سے چند اور کاغذ نکلے۔ ایک کاغذ پر بہت سے درخت بنے تھے۔ ایک بڑا درخت اور اس کے سائے میں ایک چھوٹا سا درخت۔ ایک بڑا درخت اور اس کے سائے میں ایک چھوٹا سا درخت۔ ایک بڑا درخت

— ایک اور کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں بنی تھیں پانچ چھ مرتبہ دہرایا گیا تھا "میں کہاں کہاں سے گذر گئی — میں کہاں کہاں سے —

اور اس کے بعد ایک کونے میں لکھا تھا —

شاید کہ چمن مہکا، شاید کہ بہار آئی
دنیا کی وہی رونق، دل کی وہی تنہائی

"مسٹر ہربرٹ کننگھم کیسے ہیں —؟" گھر پہنچتے ہی میں نے زرینہ سے دریافت کیا جو تھکی ماندی اپنی مسہری پر لیٹی تھی۔
"ہربرٹ کا آپریشن —" زرینہ نے کروٹ بدل کر جواب دیا۔ "اپنڈی سائیٹس کا نہیں تھا۔"

رات کو ہم لوگ ابھی کھانے کی میز پر ہی تھے کہ ہرکالے نے میرے نام تار لا کر دیا۔
"ریفرنس آپ کا تار۔ اگر یہ صورت ہے تو ڈڈو کو منٹری کینسل کر دیجئے اور واپس آجائیے۔"
"ونڈر فل" زرینہ نے کہا۔ "اب تم اطمینان سے چند روز

یہاں رہو۔ چھٹی لے کر ۔۔۔ کیا خیال ہے؟"

اسی وقت ملازم نے اناؤنس کیا: "مک فرسن صاحب میم صاحب۔"

میلکم اور سنتھیا مک فرسن کمرے میں داخل ہوئے۔ میلکم کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔

"ہربرٹ کا انتقال ہو گیا۔ ڈھاکہ ہاسپٹل سے تار آیا ہے۔" انھوں نے تار ارسلان بھائی کی پلیٹ کے نزدیک سرکا دیا۔

اس رات نیم تاریک ڈرائنگ روم کے آتشدان کے شعلوں کی روشنی میں میلکم نے اس طرح بات کی جیسے ساری زندگی کا پوسٹ مارٹم کر رہے ہوں۔

"کاش چارلس فریزر صرف ایک گھنٹہ دیر سے آتا۔" سنتھیا مک فرسن نے کہا۔

"یا نیگس اور نورا اپنا بنگلہ ریٹا فریزر کے حوالے کر کے ڈھاکے نہ چلے جاتے۔" مسٹر مک فرسن بولے۔

"مگر ریٹا فریزر تو کرنل مورگن کے یہاں ٹھہری تھیں؟" میں نے

پوچھا۔

"ہاں مگر ایڈتھ مورگن کی ریٹا سے پہلے زونہ سنے ہیں بنی۔ دراصل کرنل کی دوستی چارلس فریزر سے جنگ کے زمانے سے تھی۔ اور وہ محض کرنل سے ملنے کے لیے ہی ڈھاکے سے یہاں آیا تھا۔" سنتھیا یک فرسٹن نے کہا۔

"چارلس کینیڈین ہے۔ اور ہر کینیڈین اور امریکن کی مانند اسے بھی لوکل کلر دیکھنے کا خبط ہے۔ وہ اپنے ایک اور پرانے دوست بل مک گریگر سے ملنے چاند پور بنگال گیا اور وہاں سے شام کو ہی واپس آگیا کیوں کہ بل کو کسی ضروری کام سے چٹاگانگ جانا تھا۔ جب چارلس واپس آیا تو کرنل مورگن نے اس سے کہا کہ وہ اسے نواب یتیم پاشا سے ملانے لیجائیں گے جو آسام کے مغل عہد کے نوابین کی آخری یادگار ہیں۔ یتیم پاشا یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ چارلس اور کرنل کے وہاں پہنچنے پر نواب صاحب نے فوراً پروگرام بنایا کہ وہ مہمانوں کو شکار کھلانے سندربن لیجائیں۔ چنانچہ چارلس نے ریٹا کو ٹیلیفون پر اطلاع کردی کہ وہ کئی روز کے لیے سندربن جارہا ہے۔"

ٹیلکم مک فرسن نے پائپ منہ سے نکال کر راکھ دانی پر

کھٹ کھٹایا اور اپنے چارخانہ ٹویٹڈ کے کوٹ کی جیب میں سے ماچس ڈھونڈ کر نکالی۔ نیا تمبا کو بھر کے پائپ جلایا اور چند لحظوں تک شعلوں کو غور سے دیکھتے رہے۔ ہم سب ہمہ تن گوش ان کی طرف متوجہ تھے۔

"بے چارہ ہربرٹ کننگھم۔" میلکم بک فرسٹ نے مجھے مخاطب کر کے دوبارہ بات شروع کی۔ "ایک نوجوان انگریز پلانٹر تھا اور حال ہی میں یہاں آیا تھا۔ وہ ایک بڑا جذباتی اور بھولا بھالا سا لڑکا تھا۔ ٹی اسٹیٹ پر اس کی ہم دونوں سے بیحد دوستی ہو گئی اور میں اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھنے لگا۔" میلکم نے بہت آہستہ سے اپنی بھووں پر ہاتھ پھیرا۔ "ہربرٹ، بہت خوش شکل اور بہت دل پھینک لا ابالی قسم کا بیچلر تھا۔

"تم کو یاد ہے زرینہ، چند روز ہوئے ہم دونوں تمہیں کرنل کے یہاں ڈنر پر مدعو کرنے آئے تھے؟ اسی رات ہربرٹ کی ملاقات ریتا سے ہوئی۔

"شام کو شراب کا دور چلا۔ ایڈتھ مورگن اپنی الکحل آسانی سے نہیں سہار سکتیں۔ اس رات ان پر دورہ سا پڑ گیا

اور انھوں نے اچانک ریٹا فریزر کو طعنے دینے شروع کیے۔
جواباً ریٹا نے قہقہہ لگایا۔ کچھ دیر بعد ہم لوگوں نے دیکھا کہ ریٹا
ڈرائینگ روم سے غائب تھی۔ اور جب دوبارہ نظر دوڑائی
تو ہربرٹ کو بھی موجود نہ پایا۔

"اب سارے مہمانوں پر نشہ چڑھ چکا تھا۔ تم لوگ
جانتے ہو کہ ہم اسکاٹ لوگ بوتل پر عاشق ہیں اور بڑے
بڑے پیکڑوں کو میز کے نیچے پہنچا دیں۔ مگر اس رات تو ریٹا
کی وجہ سے عجب ہلّڑ مچ رہا تھا۔"

"رات بھیگ چلی تو میں نے میلکم سے گھر چلنے کے لیے
کہا۔ کیونکہ میں اسکاٹ تو ہوں مگر ایک کٹّر مذہبی پریسبی
ٹیرین پادری کی بیٹی بھی ہوں۔ اور مجھے اس طرح کی بے تحاشا
مے نوشی سے دہشت ہوتی ہے۔ چنانچہ میں اور میلکم کرنل اور
ایڈتھ کو شب بخیر کہہ کر باہر آ گئے تو کیا دیکھا کہ برآمدے کے
نیچے باقاعدہ فوجداری ہو رہی ہے۔" سنتھیا مک فرسن نے
اپنے شوہر کی بات مکمل کی۔

"ارے۔" ارسلان بھائی نے استعجاب سے کہا۔

"وہاں ریٹا تو نشے میں مسرور نزدیک کھڑی قہقہہ لگا رہی

تھی اور چارلس فریزر اور بے چارہ ہربرٹ ایک دوسرے کی ٹھکائی میں مصروف تھے۔ اسی وقت سارے مسرور مہمان باہر نکل آئے مگر کسی نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش نہ کی۔ اور اس منظر سے محظوظ ہوتے رہے۔

" اتنے میں ریٹا نے بے چارے ہربرٹ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تو چارلس نے آگ بگولہ ہو کر اسے دھکا دیا، اور وہ دور جا پڑی اور اس کی پیشانی میں چوٹ آ گئی۔

" دوسری صبح سویرے چارلس اکرنل کے چھوٹے طیارے کے ذریعہ چاند پور بگان روانہ ہو گیا۔ لیکن شام کو ہی واپس آن پہنچا۔ دوسرے دن کرنل اور چارلس نواب صاحب بیگم پاشا کے ساتھ سندربن چلے گئے۔

" تم بڑی ہو زرینہ۔ بوڑھے اینگس اور نورا اڈنکن کتنے شفیق اور پیارے لوگ ہیں۔ وہ دونوں اس رات دعوت میں نہیں آئے تھے کیونکہ اینگس کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔ صبح کو چارلس اور کرنل کے چاند پور بگان چلے جانے کے بعد ایڈتھ ڈنکنز کے گھر گئیں۔ ان کو مختصراً رات کا واقعہ سنایا اور نورا سے کہا کہ انہیں اعصاب کی شکایت ہے اور وہ تنہا ریٹا

کی حسبِ دلخواہ میزبانی نہ کر سکیں گی اور ڈنکنز سے مشورہ طلب کیا۔

"اب یہ بڑی آک ورڈ صورتِ حال تھی۔ کیوں کہ پچھلی رات نشے کی حالت میں ایڈتھ بھی ریٹا کو جلی کٹی سنا چکی تھیں۔ اور مار پیٹ اور جھگڑے کے بعد صبح صبح چارلس اسی طیش کے عالم میں ریٹا کو ہمراہ لیے بغیر اپنی سیاحت اور شکار کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اب ایڈتھ کہہ رہی تھیں کہ ان کے اعصاب کمزور ہو گئے ہیں۔"

جس وقت میلکم بک فرسن بات کر رہے تھے مجھے دفعتاً خیال آیا کہ راحت عرف ریٹا ان عورتوں میں سے ہے جسے دوسری عورتیں بے طرح ناپسند کرتی ہیں اور مرد جن پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے ہیں۔ زرینہ کے قصّے کے مطابق ڈھاکے کی مسز وارنگٹن کے اعصاب بھی خراب ہو گئے تھے۔

میلکم نے بات جاری رکھی "چنانچہ فرشتہ خصال نورا ڈنکن نے کہا کہ وہ دوسرے دن اینگس کے میڈیکل چیک اپ کے لیے ڈھاکے جا رہی ہیں۔ اس دوران میں چارلس فریزر کی سندربن سے واپسی کے وقت تک ریٹا یقیناً ان کے بنگلے پر

قیام کر سکتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اینگس اور نورا خود ایڈ تھر کے یہاں گئے اور ریٹا کو اپنے یہاں قیام کرنے کے لیے مدعو کیا۔ اور کہا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے ملازمین ریٹا کا پورا خیال رکھیں گے۔ ریٹا بہت خوش ہوئی اور بولی کہ اسے فوٹوگرافی کا خبط ہے اور ان کا خوش منظر بنگلہ اور سامنے کی سینری اس کے اس شوق کے لیے آئیڈیل ثابت ہوگی۔ چنانچہ ریٹا ڈنکنز کے یہاں منتقل ہوگئی اور اس کے نئے میزبان ڈھاکہ روانہ ہوگئے۔"

" اور اب یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ خواتین کی صبح گیارہ بجے کی ماہ جونگ اور کافی پارٹیوں کی گریپ وائن کے ذریعے یہ سارا قصہ کم از کم ایک "تنویل کے ریڈیس" میں بخیر خوبی پھیل گیا۔" سنتھیا نک فرسن نے کہا۔ "تم لوگ اس فلم کی تیاریوں کے سلسلے میں بہت مصروف تھیں اسلئے تم تک یہ بات نہ پہنچ سکی تین چار روز ہوئے میں نے مسز مک ڈانلڈ کی کافی پارٹی میں مسز مک گریگر کو یہ بھی کہتے سنا کہ ریٹا فریزر امریکن نہیں بلکہ دراصل کیل کٹا اینگلو انڈین ہے۔۔ اور ایڈ تھر نے جو تحقیر آمیز رویہ ریٹا کے ساتھ اختیار کیا اس کی ایک وجہ دراصل یہ بھی تھی کہ ایڈ تھر کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی گلیمرس مہمان ہاف کاسٹ ہے۔"

"اس پچھلے آٹھ دن میں ہربرٹ مجھ سے فیکٹری میں روزانہ ملتا تھا۔" میلکم نے کہا۔ "اور ریٹا کے لیے دیوانہ ہو چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ذہنی ہیجان ہے۔ اور چارلس کی واپسی پر یہ سارا قصّہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گا۔ چارلس فریزر کے متعلق میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک بیحد حسّاس اور زخمی شیر کی مانند بپھر جانے والا انسان ہے اور ریٹا کو بے طرح چاہتا ہے۔"

"چارلس کام کیا کرتا ہے۔؟" ارسلان بھائی نے میلکم کی بات کاٹ کر دریافت کیا۔

"کولمبو میں حکومت سیلون کے لیے کسی نوع کا ایڈوائزر ہے۔ بمبئی میں ریٹا سے ملاقات ہوئی۔ اب کنیڈا واپس جانے سے قبل سارے برِصغیر کی سیر کرنے نکلا ہے۔ سلہٹ وہ اپنے پرانے فوجی ساتھی کرنل مورگن سے ملنے آیا تھا۔"

"تم نے ہربرٹ کو سمجھایا نہیں ؟" ارسلان بھائی نے پوچھا۔

"سمجھایا۔ مگر اس پر عشق کا جنون سوار تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے زندگی بھر ایسی مکمل عورت نہیں دیکھی ——— ایسی عورت جس کے لیے ALL WOMAN کی اصطلاح رائج ہے۔"

"وہ مکمل عورت ہے۔" زرینہ نے دہرایا۔ قاسم نے بھی صنوبر کو چھوڑتے وقت فرحت کے لیے یہی کہا تھا۔

"اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ بے چارے ہربرٹ نے یہ سارا ہفتہ پہاڑی والے بنگلے پر گزارا۔" میلکم بک فرسن نے کہا۔

ارسلان بھائی نے آتشدان کی آگ تیز کی۔

"آج صبح ہے" میلکم بک فرسن نے سبز چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "ریٹا بہت سویرے ہی اٹھ گئی تھی۔ رات اس نے نورا ڈنکن کی آیا سے کہا تھا کہ وہ اعلیٰ الصبح تصویریں کھینچنے کیلئے باہر جائے گی۔ چنانچہ اس نے صبح اٹھ کر جلدی سے بریکفاسٹ کیا اور انگس ڈنکن کی جیپ لے کر کھاسی گاؤں کی طرف نکل گئی۔

"اور آج ہی صبح منہ اندھیرے چارلس اور کرنل سنڈرسن سے واپس آن پہنچے۔ گھر پہ ایڈتھ نے بتایا کہ ریٹا ڈنکنز کے یہاں اٹھ گئی ہے۔ اینڈ ریچ ڈنسن سیدھا پہاڑی والے بنگلے پر پہنچا۔

"اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ ملازم ابھی شاگرد پیشے ہی میں تھے صرف نورا کی آیا بنگلے پر موجود تھی۔ وہ چارلس

کو پہچانتی نہیں تھی۔ چارلس نے اس سے پوچھا کہ ۔ ریٹا میم صاحب کا بیڈ روم کدھر ہے۔ آیا نے گھبرا کر مہمان کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ چارلس سیدھا ریٹا کے بیڈ روم میں داخل ہوا جہاں بے چارہ ہربرٹ سو رہا تھا۔

"وہی بندوق جسے چارلس فریزر شکار کے لیے سندربن لے گیا تھا، اس کے کندھے سے آویزاں تھی ـــــ"

"لیکن عدالت میں وہ یہ بیان دے سکتا ہے کہ سندربن سے یہاں تک کی پرواز کے دوران میں وہ تکان دور کرنے کے لیے متواتر شراب پیتا رہا تھا اور اس کے ہوش و حواس قائم نہ تھے۔ اس کے بہت سے دوست اور شناسا یہی گواہی دیں گے کہ وہ بے انتہا پیتا ہے۔ بلکہ عادی شرابی ہے ـــــ" سنتھیا نک فرسن نے کہا۔

"جس وقت آج صبح صبح مجھے ڈاکٹر سعید نے فون کیا کہ ہربرٹ کا فوری آپریشن کرنا ہے ـــــ"

"مگر کسی نے ریٹا فریزر کو کیوں نہیں تلاش کیا؟" میں نے زرینہ کی بات کاٹی۔

"اوّل تو یہاں جنگلوں میں کسی کو ڈھونڈنا بھُوسے کے ڈھیر

میں سوئی تلاش کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ دوسرے میرے خیال میں مناسب یہی تھا کہ مسز فریزر موقع واردات پر موجود نہ ہوں۔" میلکم نے جواب دیا۔

"افوہ ۔کیا قیامت کا دن گذرا ہے ۔" زرینہ نے کہا۔

"اور کمال ملاحظہ ہو۔ میں ارسلان کو اطلاع دینے کے لیے یہاں آیا تو عین اسوقت آپ کا چپڑاسی یہ پیغام لے کر وارد ہوا کہ آپ نے مسز فریزر کے لیے بندوق منگوائی ہے۔ میرے تو یقین جانو ایک لمحے کے لیے چھکے چھوٹ گئے مجھے ایسا لگا جیسے میں "ایلس ان ونڈر لینڈ" والی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ بہرحال معلوم ہوا کہ تم ریٹا فریزر کو فلمی ہیروئن بنائے ڈال رہی ہو۔ اور اس طرح یہ بھی پتہ چل گیا کہ وہ کہاں ہیں۔

"چارلس اور ریٹا دو پولس افسروں کی معیّت میں رات کی ٹرین سے ڈھاکے روانہ کیے جاچکے ہیں۔ میں ڈھاکے میں مقیم کینیڈین ڈپٹی ہائی کمشنر کو فون کرچکا ہوں۔ خدا سب پر رحم کرے۔" میلکم نے بات ختم کی۔

"اب راحت ۔ آئی مین ۔ ریٹا کا کیا ہوگا؟" زرینہ نے پوچھا۔

"ابھی چارلس اور ریٹا کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ غالباً قانونی لحاظ سے ریٹا کا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں۔"
زرینہ نے سر صوفے کی پشت پر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔
"ارسلان۔ وہ تار مجھے دینا۔" میلکم نے کہا۔ ارسلان بھائی نے تار اٹھا کر دیا۔
"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہربرٹ کے والدین کو کیا لکھوں۔ وہ ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔" میلکم مک فرسن کہہ رہے تھے، کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ آتشدان میں لکڑیاں چٹخیں۔ ہلکی سبز دیوار پر روشن ڈائیل نے رات کا ڈیڑھ بجایا۔
میلکم نے رومال سے اپنی نم پلکیں خشک کیں۔ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم لوگ میاں بیوی کو رخصت کرنے کے لیے برآمدے میں نکلے۔ چاروں طرف چائے کے باغات اور بانس کے جھرمٹوں پر کہرہ چھایا ہوا تھا۔ چند منٹ تک ہم پانچوں ڈوبتے چاند کی بہت مدھم چاندنی میں چپ چاپ کھڑے رات کی آوازوں کو سنتے رہے۔ میلکم اور سنتھیا مک فرسن شب بخیر کہہ کر کار میں بیٹھے اور اندھیرے

میں غائب ہو گئے۔

جس روز میں چا ء بگان سے واپس جا رہی تھی، زرینہ نے راستے میں ارسلان بھائی سے دفعتاً پوچھا۔ "ارسلان، ایک بات بتائیے۔ بکمل عورت کیسی ہوتی ہے؟ ALL WOMAN؟ —— "؟

"معلوم نہیں ہے۔" انھوں نے جواب دیا۔ کار ایک دھچکے کے ساتھ پہاڑ کی ڈھلوان سے اتر کر کچی سیدھی سڑک پر آ گئی۔

شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ مزدور عورتوں کی ٹولیاں اپنے اپنے جھونپڑوں کی سمت لوٹ رہی تھیں۔ گاؤں میں دیے جلنے لگے۔

اچانک ایک موڑ پر پاربتی کی زرد ساری کی جھلک دکھلائی دی۔ کار دیکھ کر وہ ٹھٹھکی اور بندگی کے لیے ہاتھ جوڑے۔ پھر وہ چاء کی خالی ٹوکری کمر سے باندھے، تیز تیز قدم رکھتی "زوپی ٹری" کے جھرمٹ میں غائب ہو گئی۔

—— سانجھ بھئی اور دیا جرے ——

سرخ پھولوں سے دہکتے ہوئے گھنے درختوں کی

پتیاں سرسرائیں۔

"پیا نہ آئے پاس"، پپیہے نے کہا۔

"آج رام نندن کہہ رہا تھا کہ پاربتی کا گونا ہونے والا ہے۔ برادری نے فیصلہ کر دیا"۔ زرینہ نے کہا۔

ڈوبتے سورج کی کرنیں دو پتیوں اور ایک کلی کی جھاڑیوں سے سرک کر

"نینن سے دو گنگ بہیں"، کوئل نے کہا۔

اندھیرے میں جا گریں۔

"ڈوبن لاگی آس"، پپیہے نے کہا۔

نشیب میں ندی کنارے دھندلکا پھیل چکا تھا۔

لالہ رنگ افق پر دھواں اٹھ رہا تھا۔

"ندی کنارے دھواں اٹھت ہے۔ میں جانوں کچھ ہوئے جا کارن جوگن بھئی، وہی نہ جلتا ہوئے"۔ زرینہ نے کہا۔

اونچی نیچی سڑک پر دھول اڑاتے ہوئے ہم تینوں خاموشی سے مری منگل کی طرف بڑھتے رہے۔ راستے کے دونوں طرف

ٹیلوں پر سندھیا بالتی رکھی تھی جو شام پڑے مہکتی ہے مگر ویرانے میں اس کا قدر داں کوئی نہیں۔ دفعتاً میں نے زرینہ سے پوچھا "زرینہ بی بی ۔۔ راحت اور واجد، صنوبر اور قاسم اور فرحت کے متعلق تو معلوم ہو گیا۔ لیکن شمشاد کا کیا ہوا۔ وہ اب کہاں ہے۔ وہ جس کی وجہ سے کہانی شروع ہوئی ۔"

"کہانی شروع ہونے کی کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی۔ بی بی جی اور نہ اس کے خاتمے کی کوئی ایک وجہ ہے ۔" زرینہ نے کہا۔

"یہ درست ہے زرینہ بی بی۔ تمہارا فرمانا میرے سر آنکھوں پر۔ پھر بھی، اس شمشاد کا بقول تمھارے 'کیا بنا' ۔؟"

"مرزا شمشاد علی بیگ ۔" زرینہ نے ایک کھڑکی کا شیشہ چڑھاتے ہوئے جواب دیا۔" اب ٹی اسٹیشن پہ ریسرچ ڈائریکٹر ہے۔ داڑھی رکھ لی ہے۔ جماعت اسلامی کا معتقد ہے۔ اپنی بیوی کو، جو اس کی خالہ کی لڑکی ہے، پردہ کرواتا ہے۔ اسٹیشن پر جب اکا دکا سیاحوں کی ٹولیاں یا دورے پر آنے والے سرکاری افسران کر اترتے ہیں تو وہ افسران کو اپنی جیب میں لفٹ دیتا ہے۔ چاء بگان کی دنیا سے ان کو دور سے متعارف کرا دیتا ہے۔ اور داڑھی کے اندر مسکراتا رہتا ہے۔ اکثر، دوران

گفتگو میں تبلیغ اسلام بھی کرتا ہے۔"

ارسلان بھائی خاموشی سے کار چلانے میں مصروف رہے۔ اب دور سے سری منگل کے ڈاک بنگلے کی ٹمٹماتی روشنیاں نظر آرہی تھیں ہم تاریک رات میں اسٹیشن کی جانب رواں ہے۔ آم کے درختوں میں سے ٹی ریسرچ اسٹیشن اور اس کے بنگلوں کی روشنیوں کی جھلک دکھلائی دی۔ کچھ دیر بعد ہم ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے۔ جس کے سنسان پلیٹ فارم کے مختصر سے برآمدے میں ایک اکیلا مسافر اکڑوں بیٹھا اخبار کے کاغذ جلا جلا کر آگ تاپ رہا تھا۔

ٹرین حسب معمول ایک گھنٹہ لیٹ تھی۔ پٹریوں کے قریب کار ٹھہرا کر ہم انتظار میں مصروف ہو گئے۔

"زرینہ بی بی" میں نے دور تاریکی میں غائب ہوتے ہوئے تار کے کھمبوں کو دیکھتے ہوئے سردی سے کانپ کر کہا ـــــــ

"اگر تم کو ٹروتھ سیرم TRUTH SERUM کا انجکشن لگا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کا وسلہٹ لیٹر، لکھ کر آئینے کو بھیجو گی؟"

"بی بی" زرینہ نے سوں سوں کر کے جواب دیا۔ اگر تم کو

ٹروتھ سیرم کا انجکشن لگا دیا جائے تو اس کے بعد تم کس قسم کی ڈوکومنٹری بناؤ گی؟"

کمرہ گہرا ہو گیا۔ ارسلان بھائی نے سگریٹ جلایا تو لائیٹر کی روشنی زور سے چمکی۔ کچھ دیر بعد زرینہ نے سر ہلا کر ذرا شرماتے ہوئے کہا۔ "بی بی۔ ایک سوال مجھے عرصے سے پریشان کر رہا ہے۔"

"فرماؤ۔"

"خدا نے یہ دنیا کیوں بنائی ———؟"

"ایں —؟"

"ہاں —کیوں —؟ آخر کیوں —؟ مجھے اس کی کوئی ایک وجہ بتاؤ۔"

ارسلان بھائی نے ادھ جلا سگریٹ کھڑکی سے باہر پھینکدیا۔ اور دوسرا سگریٹ جلایا۔

"یہاں تین سال تنہائی میں زندگی گذارنے کی وجہ سے مجھے پڑھنے کا موقعہ مل گیا۔ جو میں ڈاکٹری کے چکر کی وجہ سے پہلے کبھی پڑھ نہ سکی تھی۔ اور بی بی۔ میں نے بہوت پڑھ ڈالا۔ مختلف فلسفے۔ اور مختلف مذاہب ہندو مت اور بدھ مت اور اسلام اور تصوف اور کیتھولی سی زم۔ مگر اس سوال کا جواب

مجھے نہ ملا کہ آخر اس ذات مطلق نے دنیا بنائی ہی کیوں۔
یہ لیلا کس لیے رچائی آخر ——؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ مہاتما بدھ
بھی دراصل ایک مرتبہ افیم کھا گئے تھے یہ نروان وغیرہ سب
اسی کا نتیجہ تھا۔ اور اگر —" اس نے کھنکھارتے ہوئے بات
جاری رکھی۔" اگر پانچ منٹ کے لیے فرض کر لو ۔"
" ہاں ۔ اگر پانچ منٹ کے لیے فرض کر لو۔" میں نے دہرایا۔
" کہ آپ سے آپ ارتقاء ہو گیا —۔ تو ارتقاء بھی کیوں ہوا
بھائی ۔؟ کوئی تک تھی —؟ وجہ تھی —؟"

دور سے گڑگڑاتی، کہرے کو چیرتی ٹرین اسٹیشن پر آ پہنچی۔
میں نے اٹیچی کیس سنبھالا۔ قلی نے ڈکی سے اسباب نکالا میں
ٹرین میں سوار ہوئی۔ ارسلان بھائی نے گارڈ سے بات کی
ڈبہ خالی پڑا تھا۔" چٹخنیاں اندر سے اچھی طرح چڑھا لینا۔"
ارسلان بھائی نے فکر کے ساتھ کہا۔ میں نے ایک بار پھر
خوابیدہ سلہٹ کو خدا حافظ کہا۔ میری پیاری کزن زرینہ
اور ارسلان بھائی خاموش پلیٹ فارم پر دھند لکے میں
دو پرچھائیوں کی طرح کھڑے رہ گئے۔

ٹرین نے سپاری اور کیلے کے جھرمٹوں میں دوڑنا شروع کیا۔
گھپ اندھیری رات جو مہا کالی، مادرِ فطرت، وقت کی راجدھانی
ہے۔ ایک ریلوے کراسنگ کے نزدیک جھونپڑی کی منڈیر
میں چراغ جل رہا تھا۔ تالاب کے کنارے ایک درگاہ
میں روشنیاں ٹمٹا رہی تھیں۔ تالاب پر کائی پھیلی تھی اور
کنول کھلے تھے۔

"ست چت اور آنند، جو مایا میں اس طرح پوشیدہ
ہیں جیسے تالاب پر کائی جم جاتی ہے"
میں نے کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکا کر آنکھیں بند
کر لیں۔ اور مجھے بہت سے، ہمیشہ یاد رہ جانے والے منظر
یاد آئے۔

شاہ جلالؒ کی درگاہ کا حوض۔
ایک بوڑھی ہندو عورت جو حوض کی منڈیر پر جھکی سیاہ
پانی میں تیرتی سُرخ متبرک مچھلیوں کو بڑے غور سے دیکھ
رہی تھی۔

بانس کے ڈبوں میں چائے کے بیج کے کیڑے جمع کرتے
ہوئے بچے۔ بانس کے پُلوں پر سے گذرتے، جھنریاں لگا...

ڈوری سے لٹکی تیل کی بوتلیں سنبھالے کسان۔ بید کے پودے۔ پلاش اور بیل کے جنگل۔ بھویا گانے والوں کی آواز۔ ایک چھوٹا سا، کالا بچہ، جسے اس کا باپ بڑی احتیاط، بڑے لاڈ سے ایک تالاب میں نہلا رہا تھا۔

راج شاہی کے دور افتادہ گاؤں کے چائے خانوں میں بیٹھے سنجیدگی سے اخبار پڑھتے ہوئے داڑھی والے کسان ۔ الاؤ کے گرد جاگ گان کی محفل۔ نور العباد کی کوٹھری میں جلتا ہوا دیا۔

روشن لالٹینیں ہاتھ میں لٹکائے، ہاٹ کی سمت آتے ہوئے کسانوں کی ٹولیاں۔ نیلی، عنابی، اودی تہمدیں۔ نیلی، عنابی اودی ساریاں۔ سفید دھوتیاں۔ کُم کُم کے بڑے بڑے روشن ٹیکے۔ کاجل سے بھری آنکھیں۔ بھوک سے پچکے پیٹ۔ دوتارہ بجاتے باؤل[1] اور اس کے بعد۔ واجد اور ریٹا فرینزر عفور الرحمٰن میاں اور پاربتی۔

آدھی رات کے سناٹے میں انہیں کی آواز سُنائی دیتی ہے،

---

[1] نوا ئے سرمدی۔

سری رام کرشن کے ایک عزیز چیلے، غالباً وویکانند نے بیلور مٹھ میں مہا کالی کے چرنوں میں پھول چڑھا کر دنیا تیاگتے ہوئے کہا تھا ——

راج راجیشوری - بھونیشوری - سد ھیشوری،

اپنی تقدیس اور اپنی ناپاکی۔ اپنا دھرم اور اپنا ادھرم، اپنی ودّیا اور اپنی اودّیا، اپنے پاپ اور اپنے پن، اپنا خیر اور اپنا شر، اپنی نیکی اور اپنی بدی، سب لے لو، اور مجھے خالص بھگتی دیدو ——

اور میری کزن زرینہ نے تھوڑی دیر ہوئی، سوال کیا تھا، "خالص بھگتی میں بھی کیا مل جائے گا — ؟"

ہلتی جُلتی، چرّخ چوں کرتی ٹرین اتھاہ رات کے سمندر میں سے گذرتی ڈھاکے کی طرف رواں رہی۔

دنیا میری سمجھ میں نہیں آئی۔

قرۃ العین حیدر

۲۹ر دسمبر سنہ ۱۹۶۴ء

ایک خواب اور
سردار جعفری کی نئی نظموں کا مجموعہ
جسے حلقۂ ادب بمبئی نے شائع کیا ہے
قیمت : چھ روپے
ملنے کا پتہ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جے. جے اسپتال بمبئی ۳